خمارستان

آغا شاعر قزلباش دہلوی

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی
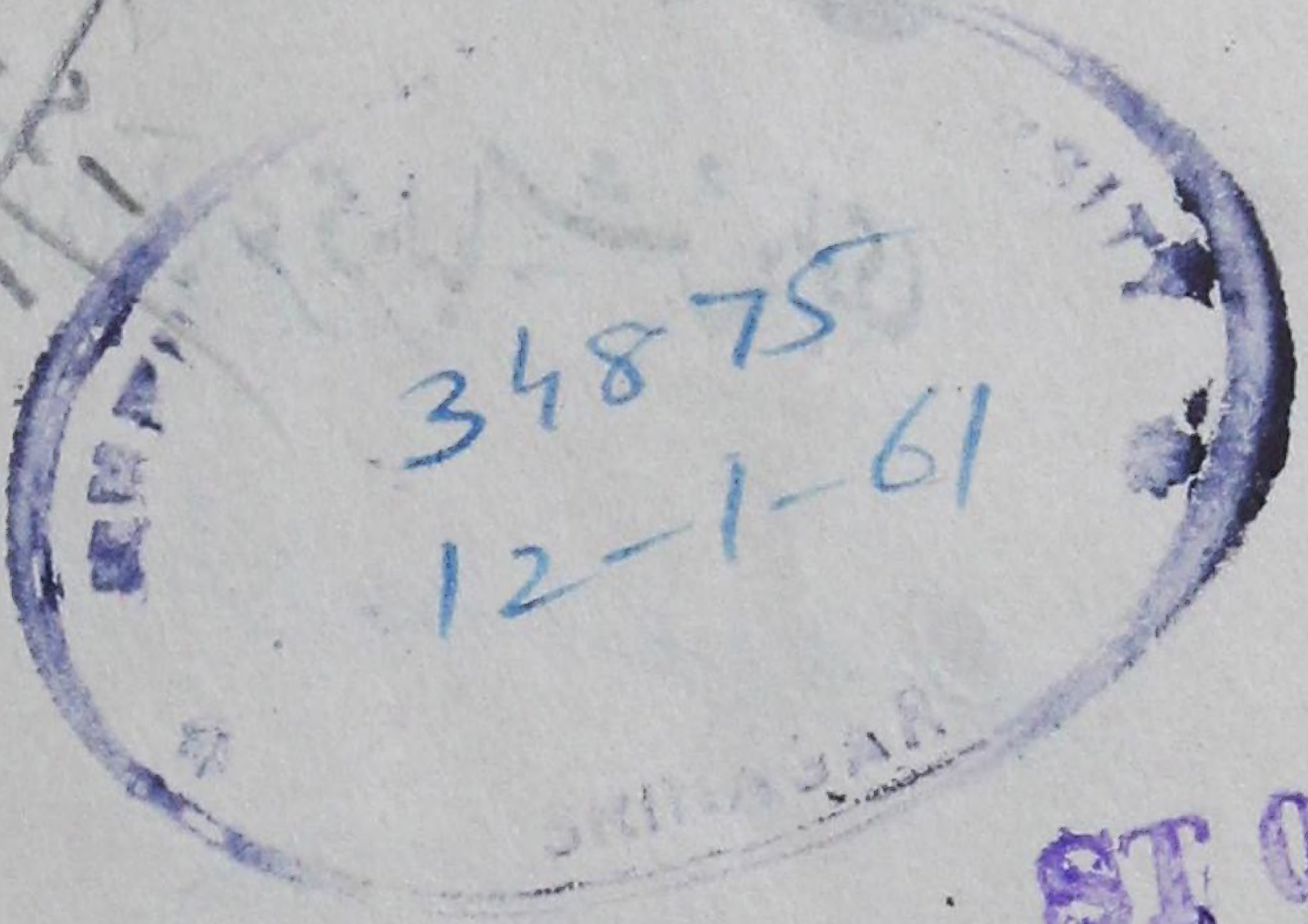
قیمت :- تین روپے

(یونین پریس دہلی)

فہرست مضامین

یہ مجموعہ مرحوم کی آہ اور واہ دونوں پر مشتمل ہے۔

مرحوم نے اپنی زندگی کا ایک حصہ اُن رنگ رلیوں میں بھی بسر کیا تھا جن کا اُن کے عہدِ شباب کے دور میں آنے کا فقدان نہ تھا۔ لیکن یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ باوجود اُن تمام اسباب کے جو ایک فرشتہ کو بھی "چاہ بابل" تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ انسان ہی رہے اور انسان بھی ایسے بھولے، ایسے سادہ مزاج اور ایسے مخلص کہ اب آپ چراغ کیا یدِ بیضا لے کر بھی تلاش کریں تو کہیں میسّر نہیں آسکتے۔

میں نے جب اس مجموعہ کو پڑھا، تو میں نے ایسا محسوس کیا کہ مرحوم مجھ سے باتیں کر رہے ہیں اور میں مادّیات کے خارزار سے نکل کر ایک ایسے کُنج میں پہونچ گیا ہوں جہاں محبّت و خلوص کی روحانیت کے سوا کچھ نہیں۔

انسان پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب عقل و فرزانگی سے گھبرا کر وہ بچّوں کی سی بھولی بھالی باتیں کرنا چاہتا ہے۔ جب وہ ہوش و فراست کی وزنی زندگی سے پریشان ہو کر محض محبّت و خلوص کی سُبک زندگی کا لُطف اُٹھانا چاہتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم میں سے کسی شخص کو اِس کی تمنّا ہو تو اب وہ آغا شاعرؔ کے بعد اُن کے اس مجموعہ ہی کے مطالعہ سے پوری ہو سکتی ہے۔

لکھنؤ

۶ مئی سنہ ۴۳ء

نیاز فتحپوری

پیش لفظ

خمارستان، مجموعہ ہے مرحوم آغا شاعر قزلباش دہلوی کے اُن خیالات کا جو وقتاً فوقتاً اُن کے قلم سے ظاہر ہوئے تھے۔ یہ اُن کی وہ بے تکلفانہ رائیں ہیں جن میں تحریر سے زیادہ تقریر اور تنقید سے زیادہ تفریح کا لطف آتا ہے۔

آغا شاعر۔ داغ کے شاگردوں میں صف اوّل کے شاگرد سمجھے جاتے تھے اور اُستاد کی صحبت سے انہوں نے پورا فائدہ اُٹھایا تھا۔ شاعری میں انہوں نے وہ سب کچھ لکھا جو داغ کے ایک ممتاز شاگرد کو لکھنا چاہئے تھا۔ اور نثر میں جو کچھ لکھا وہ وہی تھا جس کی توقع دہلی کے ایک زباندان ــــــ سے کی جاسکتی تھی۔

اس مجموعہ میں نہ فلسفہ ہے نہ تاریخ۔ نہ کوئی دبی اُپج ہے نہ کوئی ناقدانہ تحقیق۔ بلکہ ایک سادہ سا مطالعہ ہے، اُن مناظر و حالات کا جن سے لکھنے والا دوچار ہوا۔ اور بے تکلفانہ اظہار ہے اُن تاثرات کا جن سے اُن کا دل متاثر ہوا۔ جن کو آغا شاعر مرحوم سے ملنے اور اُن کی باتیں سننے کی مسرت حاصل ہوئی ہے، وہ اس مجموعہ سے بھی اُن کی گفتگو کا لطف اُٹھا سکتے ہیں۔ اور اس لئے یہ مرحوم کی ایک ایسی زندہ یادگار ہے۔ جس کی صحیح قدر اُن کے جاننے والے ہی کر سکتے ہیں۔

اس مجموعہ میں ۳۰ مقالے ہیں۔ جن میں سے بعض محض ادبی ESSAY کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض ان کی زندگی کے واقعات سے متعلق ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جن میں انہوں نے ماضی کی صحبتوں کا ذکر کیا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ

نثرِ شاعر

دہلی کے رسالہ چمنستان کے نوجوان مدیر آغا سرخوش قزلباش نے جو ہمارے مرحوم دوست افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی کے ہونہار فرزند ہیں - ادب اُردو کے شائقین پر احسان کیا ہے کہ شاعر مرحوم کے مضامینِ نثر کو طاقِ نسیاں میں دھرے رہنے سے بچا لیا ہے - آغا شاعر میں یہ خصوصیت تھی کہ اُن کے قلم کو نظم ونثر دونوں میں روانی حاصل تھی اور اُن کی نثر سلاست کے ساتھ دہلی کی نتھری ہوئی زبان کی چاشنی لئے ہوتے ہوتی تھی اور جہاں تک تخیل کا تعلق ہے اُن کی نثر میں بھی نظم کا لطف موجود رہتا تھا - اِس مجموعہ کا نام "خمارستان" رکھا گیا ہے شاید اس لئے کہ مضامین بھی بعض بعض رنگ خمار لئے ہوئے ہیں - مثال کے طور پر ایک مضمون لے لیجئے جس کا عنوان ہے "پوشیدہ" اس میں ایک حسینہ کا بیان ہے جس نے اپنا نام "پوشیدہ" بتایا - یہ مضمون اس طرح شروع ہوتا ہے "یاد دش بخیر - یہ جوانی دوانی کے متوالے نقوش ہیں" کہ آغا صاحب "پوشیدہ" کا قصہ سناتے ہوئے ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ "یہ لفظ لفظ واقعہ ہے" مگر پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ آغا صاحب نے یا تو ایک چھوٹا سا فسانہ لکھا ہے - مگر اسے اصل کر دکھایا ہے - یا یہ کہ اُس عجیب تنہائی کی زندگی میں جس کا نقشہ اُنہوں نے کھینچا ہے - اُن کے دل کی آنکھوں کے سامنے ایک حسین تصویر "پوشیدہ"

نامی پیش کر دی - جس نے اُن کی ایک شام کو رنگین بنا دیا - مگر صبح ہونے سے پہلے وہ آنکھوں سے ایسے اوجھل ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں - اگر اس مضمون کو لکھتے ہوئے آغا صاحب متوالے دکھائی دیتے ہیں - تو دوسرے مضمونوں میں اچھے خاصے بیدار بلکہ دوسروں کو جگانے والے نظر آتے ہیں وہ مصلحانہ طرز کے ہیں۔ ایک اصلاحی مضمون کا عنوان ہے "بڑھو ورنہ کچل ڈالے جاؤ گے" اسی میں اپنے اہل وطن کو پر زور الفاظ میں دعوت ترقی و عمل دی گئی ہے ایک اور مضمون میں "ہندوستانی بھائیوں" یعنی ہندو مسلمانوں - سکھوں - یہودیوں عیسائیوں سے خطاب کر کے انہیں آپس میں مل کر رہنے اور ایک دوسرے کے ہوا خواہ ہونے کی رغبت دلائی ہے - "اپنے خالق کو پہچان" اور "ایک قطرۂ خون کی سرگذشت" میں واعظانہ رنگ ہے اس میں انسان کو موثر الفاظ میں اس کی ابتداء اور انتہا کی طرف توجہ دلائی گئی ہے - "باغ بہشت"، یوں تو دیرہ دون کے سبزہ و گل کی تعریف ہے مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آغا شاعر مناظر قدرت کے دلدادہ تھے اور جب اُن کی نگاہ اُن نظاروں پر پڑتی تھی تو اُنھیں وہ خالق یاد آجاتا تھا - جس نے قدرتی نظاروں کو یہ زیبائی بخشی ہے - یہی مذاق "چھوئی موئی" والے مضمون میں نمایاں ہے - "حسن اُردو کا حجاب" ایک ایسا مضمون ہے - جس سے زبان اُردو سے اُن کی گہری محبت کا پتہ چلتا ہے - ان چند عنوانوں سے جن کا ذکر کیا گیا - یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس چھوٹے سے مجموعے میں رنگا رنگ کے مضامین ہیں جن سے آغا شاعر کی طبیعت کی بوقلمونی ظاہر ہوتی ہے - آغا شاعر اُن لوگوں میں سے تھے - جو اُردو کے عاشق

تھے ۔ اور جنہوں نے عمر بھر اس زبان اور اس کی ادبیات کی خدمت میں گذاری
کبھی کبھی فارغ البالی کے دن بھی دیکھے ۔ لیکن زیادہ وقت تنگیٔ معاش میں گذرا۔
پھر بھی اپنے کام سے غافل نہیں ہوئے ۔ ان کی غزلوں کا ایک دیوان مطبع مخزن
سے "تیر و نشتر" کے نام سے شائع ہوا تھا ۔ مگر کلام منظوم اس کے سوا بھی ہوگا
جو کبھی چھپنا چاہیئے ۔ اپنی عمر کے آخری دور میں آغا شاعر صاحب نے
"قرآن شریف" کا منظوم اُردو ترجمہ کیا تھا ۔ جس میں وہ سالوں مصروف رہے
تین سیپاروں کا ترجمہ شائع بھی ہوا تھا ۔ اس کی اشاعت کی ابھی تجویزیں ہی زیر
غور تھیں کہ آغا صاحب کو پیام رحلت آگیا ۔ مرحوم کے بہت سے دوست اور
شاگرد اس مجموعۂ نثر کی اشاعت سے خوش ہوں گے ۔ اور اسے شوق سے
لیں گے اور پڑھیں گے ۔ مگر زیادہ شوق سے ادب اُردو کے طلبہ کو پڑھنا
چاہیئے تاکہ وہ دیکھیں کہ قصر اُردو کا یہ چابکدست صنّاع کس بے تکلفی سے اِس
کے در و دیوار پر گلکاری کرتا تھا ۔

بھاولپور
۱۳ / اپریل سنہ ۱۹۴۳ع

عبدالقادر

یادِ وطن

پیارے وطن! راج دلارے وطن! اے بائیس[۲۲] خواجہ کی چوکھٹ! دِلّی شاہجہان آباد! کوئی دن نہیں جاتا جو میں تیرے لئے چُلّوؤں آنسوؤں سے نہ روتا ہوں۔ اے جنّت سواد شاہجہان آباد تیری خاک مجھے پسے ہوئے موتیوں سے بڑھ کر ہے۔ میں تجھ ہی میں پیدا ہوا۔ کھیل کود کر بڑا ہوا تو نے ہی پال پوس کر پروان چڑھایا۔ اور اب تجھی میں مرنا بھی چاہتا ہوں تو کہاں ہے؟ کس مقام پر ہے؟ میں تو اُس جگہ ہر ستو ستو دفعہ سر کے بل جا کھڑا ہونے کو تیار رہوں۔ جہاں تیری چھینٹ ہی پڑی ہو تیری ہوا ہی اُدھر سے آتی ہو۔ اے میرے بچپن کے گہوارے۔ میری جوانی دیوانی کی گلزار دُنیا۔ میری

زندگی کی خوشگوار چہل پہل اگر پردۂ دُنیا پر کوئی محبوب ترین چیز ہے تو وہ میرے لئے تو ہے فقط تو۔ تیری وہ نفاست وہ پاکیزگی وہ تیری گھما گھمی، وہ چاندنی چوک۔ وہ لال کنواں۔ وہ زیرِ جامع مسجد، جہاں تھالی پھینکو تو سروں پر چلی جائے۔ وہ ہر شام کو تیرے بازاروں کی رونق۔ وہ سفید پوش بانکے ترچھے نوجوانوں کا قہقہہ زن اِدھر سے اُدھر ایلا گیلا پھرنا۔ وہ پھولوں کی مہک وہ کٹوروں کی جھنکار۔ سودے سلف والوں کی رنگیلی چٹکیلی آوازیں، موٹروں کا دوڑنا، ٹریموے کی ٹن ٹن، گاڑی گھوڑوں کی آمد و رفت۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں۔ اِس دلِ مہجور کو کیونکر بہلاؤں۔ اے غریب نواز شہر جس میں کبھی ایک پیسے کے چار سودے ملجایا کرتے تھے اور غریب اپنا پیٹ پال لیتے تھے۔ اب بھی میں جہاں جاتا ہوں تیری ہی نسبت مجھے دی جاتی ہے، اور جہاں موجود ہوں تیرے ہی نام سے پکارا جاتا ہوں ؎

میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں
گو دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں

پیارے وطن! یہ تجھی میں وصف ہے کہ تیری پاک اور پوتر نرمل جل سے بھری جمنا جی گو اب پایاب رہ گئی ہے۔ مگر پھر بھی ہزاروں انسانی گناہوں کے دُور کرنے کا اثر اس میں اب بھی موجود ہے۔ اے رِشی اور منی جگت گروؤں کے باسی! اے راجا مہاراجاؤں کی مشہور راجدھانی۔ اے علم و حکمت کے مرکز تیری خاک سے اب بھی جو جوہر پیدا ہوتا ہے وہ آسمانِ شہرت پر نیرِ اعظم سے پہلو مارتا ہے۔ اے شاہانِ اسلام کے قدیم پایۂ تخت تو اب بھی اسی مرکز پر ہے اور تجھ میں اس وقت بھی گورنمنٹ برطانیہ کا راج استھان مانا جاتا ہے۔ اے دلّی۔ ہماری دلّی تو میرا ہی ایک دل نہیں بلکہ تمام ہندوستان کا دل ہے۔ سارے جہان کا دل ہے۔ ہے کوئی جو میری آنکھوں سے تجھے دیکھے؟ ہے کوئی جو میری طرح اپنی نگاہیں تجھ پر نثار کرے۔ دیکھ وہ لندن کا قصر بکنگھم اب بھی تیری لال کرسی سے دبا جاتا ہے۔ اے مینو سواد سلیم گڑھ وہ تو ہی تو ہے جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔

میرے پیارے وطن! یہ بھی عجیب بات ہے باوصفیکہ میں

تجھ سے کوسوں دور ہوں جب تکیے پر سر رکھتا ہوں تو تجھ کو صدہا میل اپنے سے فاصلے پر پاتا ہوں، مگر اُس پر بھی رات دن تیرے بازار تیری گلیاں بلکہ تیرے در و دیوار تک میری آنکھوں میں پھرتے ہیں۔ ہاں ہاں تیرا تنکا تنکا مجھے حد سے زیادہ پیارا ہے۔ اگر زمانہ مجھے اتنا بلند کرے اتنا بلند کرے کہ فرشِ مخملی میرا بستر ہو۔ قاقم و سنجاب میرا لباس۔ دُنیا کی ہمہ نعمت خواہش سے پہلے میرے سامنے ہو۔ چاندی سونے کے برتنوں میں کھاؤں اور پیوں اور ہزاروں سر میرے سامنے جُھکتے ہوں جب بھی میں یہی کہوں گا۔ آہ وطن! وطن! میرا پیارا وطن کہاں ہے؟ مجھے میرا وہی بوریا جس پر میں کبھی بیٹھا کرتا تھا اور بڑے بڑے اُمراء۔ کُملا۔ دولتمند فقیر۔ دوست۔ دشمن سب کے سب مجھے وہیں آ کر سلام کر جاتے تھے وہ مجھے تختِ طاؤس سے بھی کہیں بہتر تھا۔ میرا وہی زرین بسیرا جہاں میں گرمی جاڑے برسات اپنی نیند سونے اور اپنی نیند اُٹھنے میں کاٹتا تھا وہی مجھے سکندرِ اعظم کے مضبوط سے مضبوط قلعے سے بھی مستحکم تھا۔ ابھی تھوڑے ہی دن گذرے ہیں، ہاں ہولی کا زمانہ

تھا۔ بہار کا موسم شروع تھا۔ اس وقت مجھے اپنے وطن کی ایک
ہولی ضرور یاد آئی تھی۔ جب کبھی میں زندہ تھا اور سارے شہر میں
مجمع احباب کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا پھرتا تھا یہ الفاظ ابھی
زبانِ قلم سے ادا ہی ہوئے تھے جو کسی نے چپکے سے کان میں
کہا "اور وہ ٹوٹے کنوئیں کی سیر" ۔ وہ سیر کیا بھول ہی گئے ؟۔
ہاں ہاں جبکہ ایک گلابی کرتا گلے میں تھا۔ لبس کی سر پر، سلمے
کی پاؤں میں ۔ بال بکھرے اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ العظمت للہ
کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں
رحمتِ خدا ہو اُس کی تربت پر جس قادر الکلام کا یہ شعر ہے۔
ہاں پیارے وطن ! اِس وقت مجھے وہ نظارہ یاد آ گیا۔ آنکھوں
میں پھر گیا۔ فی الواقعی ۔ دریا کے کنارے ٹوٹا کنواں تھا۔ اور میں
وہ سُریلی ۔ رسیلی صدائیں تھیں اور میں۔ چاندی کے بالکل چاندی
کے آدمی تھے اور میں۔

جھولا پڑا ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی بھرن پڑ رہی تھی، کچھ جھولتے۔ کچھ
جھلاتے ۔ ایک نے پچکاری ماری، دوسرے نے عبیر چھڑکا تیسرے

نے گلال برسایا۔ اور جھوٹے کی پینگ کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ جوان
جان کھیل کود کے رسیا، جب وہاں سے پھرے تو دسترخوان بچھا
خوش ہو ہو کر مزے مزے کے کھانے کھائے۔ برسات کا موسم آیا
زل دھارا اوپر دھار برسنے لگا۔ باغوں کی سیر کی سوجھی، آم اور
جامنوں کے ٹوکرے پٹ گئے۔ جتنے کھائے اُتنے کھائے باقی سے
چوبھی کھیلی اور مہندی لگے پاؤں کیچڑ میں بھرے سنے لت پت قالینوں
پر چھاپے مارنے لگے۔

اللہ اللہ! وہ سمے اب خواب و خیال ہو گئے باتیں کہانیاں
ہو گئیں یہ سارے چونچلے تیرے ہی دم سے تھے۔ پیارے وطن!
اب نہ وہ تو ہی اور نہ وہ ہم۔ خُدا رہتی دُنیا تک آباد شاد رکھے تیرے
کھیڑے بسائے اور تجھے دن دُونی عزّت نصیب ہو۔ ہماری تو اب
یہ حالت ہی کہ یہ مصرع کم و بیش ہر وقت کا وظیفہ ہیں ؎

خاکِ وطن از روضۂ رضوانِ خوشتر — خارِ وطن از سنبل و ریحانِ خوشتر
یوسف کہ بمصر بادشاہی می کرد — میگفت گدا بودنِ کنعانِ خوشتر

نیا سال

لاموجود اِلا اللہ! رات دن گزرتے گزرتے سال تمام ہو جاتے
ہیں اور سالہا سال بڑھتے بڑھتے صدیوں کی خبر لاتے ہیں۔ یہ دُنیا
اِسی طرح چلی آئی ہے اور خدا جانے کب تک اسی روش پر
چلی جائے گی۔ اصل میں وقت ایک بینڈ ایکٹ شہسوار ہے جو
اپنے اسپِ دورکابہ کو سرپٹ لئے جارہا ہے۔ نہ ران کی خبر ہے
نہ باگ کا ہوش۔ اُس کی روندن میں اگر کوئی آجائے آجائے وہ
مڑکر بھی نہیں دیکھتا کہ کس پر کیا گزری؟ پلک جھپکی اور وہ کہیں سے
کہیں جا پہنچا۔ نشیب و فراز یا انقلاب! انھیں آنکھوں دیکھتے دیکھتے
کچھ سے کچھ ہو گزرے مگر ہمیں اس کا مطلق احساس نہیں حالانکہ
گھنٹے گھڑیاں اپنے اپنے وقت پر برابر ٹن ٹن کئے جاتے ہیں۔
گھڑیال کی ٹکوریں پیہم پڑ رہی ہیں مگر ہم نے کبھی بھولے سے بھی یہ

جائزہ نہیں لیا کہ فلاں گھڑی سے فلاں پہر تک ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ؟ باوصفیکہ زمانہ بآوازِ جرس پکار رہا ہے کہ پرکھ لو پرکھا لو ٹھونک لو، بجا لو تم اِس بازار میں پھر آنے والے نہیں - اپنی جنس کو تو لو جانچو - دوسرے کے مال کو سچی نیت سے آنکو، مگر یہاں سُنتا کون ہے ؟ اور ہوش کسے ؟ ایک لالچ ہے لالچ - ایک خود غرضی ہے خود غرضی جو مارے ڈالتی ہے - موت آہ موت ہم میں سے اکثر کو سُلا بھی چکی - بُہتیری بولتی چالتی، کھیلتی مالتی مورتیں ایکا ایکی ہمارے سامنے سے غائب بھی ہو گئیں - مگر ہمیں جھوٹوں بھی سان گمان نہیں کہ کبھی ہم پر بھی یہ حالت طاری ہونے والی ہے یا نہیں ؟ آہ ! آہ ! وہ جانے والے ہم میں سے کیوں چلے گئے ؟ اور کیوں چلے گئے ؟ ہمیں تو اس کے جواب کی بھی ضرورت نہیں ہم اس کا تسلّی بخش جواب دیں بھی تو کیا دیں ؟ ہمیں اپنی خواہشوں، اپنی روز افزوں خود غرضیوں سے فرصت ہی کہاں ہے - ہم تو اپنے رنگ رلیوں میں مست ہیں - ہاں البتہ خیالات اور مقاصد جُداگانہ ہوں تو ہوں -

اکثر روٹی کے دکھیا، بعض زر، زمین، زن کے پُجاری کچھ ذاتی وجاہت اور دوست دشمنی کے پھیر ہیں۔ مگر ہے ایک قسم کی یکساں خواہش اور لالچ۔ نہیں ہے تو کسی کو ذرّہ برابر وقت کے چھچاؤ کا پاس نہیں ؎

نظر کے سامنے مٹتی چلی جاتی ہیں تصویریں
مگر یہ آئینہ خانہ سدا معمور رہتا ہے (افسر الشعرا)

اِسی کے ساتھ ساتھ ایک خاموش صدائے سروش بھی ضرور ہی، اک انجان ناصح ہے۔ ضرور ہی۔ جو کبھی کبھی چپکے سے ہمارے کان میں یہ کہے جاتا ہے کہ اے غافل ہستیو! یہاں کسی چیز کو قیام نہیں، دوام نہیں، ہوشیار! ہوشیار! مگر ہم گردن ہلا کر اُسے بھی جھٹک دیتے ہیں اور اپنے اِسی خیال میں مگن ہو جاتے ہیں کہ ہماری یہ دیوار چرخ چہارم تک کسی طرح پہنچ جائے۔

مثلاً ملاحظہ کیجئے یہ ابھی کل ہی کا ذکر ہے کل ہی کی تو بات ہی کہ زارِ رُوس جیسا شہنشاہ دُنیا کا عظیم الشان فرماں روا جس کی آمد آمد کی دھوم سُنتے سُنتے ہم بچّے سے بوڑھے اور بوڑھے

سے پیر زمین گیر ہو گئے۔ وہی قاہر شہنشاہ ایک معمولی قیدی بلکہ خونی کی طرح ایک رات کو سر کے بال پکڑ اپنی خواب گاہ سے زبردستی کھینچ لیا جاتا ہے۔ اس کی جلیل القدر ملکہ اس کے پیارے بچے۔ وفادار نوکر سب کے سب ایک جگہ کھڑے کر کے گولیوں سے اُڑا دیئے جاتے ہیں اور ایک آواز بھی کسی متنفس کی اس کے بچاؤ کے لئے نہیں بلند ہوتی۔ آواز تو آواز کسی کے منہ سے بھاپ بھی نہیں نکلتی یہ ہی وقت اور زمانے کا نشد" دیگر ہائے ہمیں بھاویں بھی نہیں۔ چنانچہ موجودہ تلاطم خیز زمانے میں سے گزرتے گزرتے آج ہم اپنے نئے سال کی آمد کا پیغام سُنا رہے ہیں اور ساتھ کے ساتھ یہ دُعا بھی کرتے ہیں کہ وہ قوی و قادر، وہ حافظِ حقیقی و سہنر ہاتھ والا پرماتما اسے ہمارے دکھیا ملک میں ٹھنڈک سبا کے امن و اطمینان سے گزارے ملک ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے انسانوں کے لئے خدا کرے یہ امن چین کا سال ہو۔ آمین ربّ العالمین ؎

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است
تو بدیں آرزو۔ مرا برسال

دامانِ بہار

بہار کا مہینہ شروع ہوتے ہی کارپردازانِ قضا نے سارے درختوں کے چولے ہی بدل ڈالے۔ ہر جگہ حسینانِ جہاں سبز پوش نظر آتے ہیں۔ نئی نئی کونپلیں پھوٹیں شگوفے کھلے اور قدرت نے دامانِ بہار پر اتنے گل بوٹے بنائے کہ چپّہ چپّہ آئینہ حُسن بن گیا۔ ایکا ایکی زمین کی گود سے بیشمار پھل پھول اُبل پڑے اور سبزۂ نوخیز انگڑائیوں پر انگڑائیاں لینے لگا۔ شفاف ندّیاں چپ چپ کرتی رنگا رنگ پھولوں کے گلدستے اُچھالتی کیسی اٹکھیلی بہہ رہی ہیں۔ انھیں میں چھوٹے چھوٹے خوش نما پرندے ہیں کہ رنگین پھولوں کی پنکھڑیاں اپنی چونچوں میں لئے گویا ایک دوسرے پر گلبازیاں کر رہے ہیں طوطوں کے جھلّڑ۔ بگلوں کی قطاریں۔ فازوں کے پرے بلبلوں کے غول کے غول۔ سارسوں کے جوڑے مور۔ ہرن اور چیتل پاڑے اپنے

اپنے مقام پر مگن ہیں۔ گویا انسان ہی پر اس تازہ بہار کا جادو نہیں بلکہ تمام وحش و طیور اپنی جگہ سرگرم نشاط ہیں۔

ایک گھاس کی پتّی سے لے کر خوش رنگ کلی تک خوشی کی دولت سے مالا مال ہے۔ گزرگاہیں معطر ہیں۔ نسیم اِٹھلا اِٹھلا کے چل رہی ہے اور اِن عالمگیر مسرتوں میں چور ہو کر مُرغانِ چمن باغ کی دیواروں پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ خوشبوؤں کے قافلے ہواؤں کے کندھوں پر سوار لدے پھندے باغ سے نکلتے ہیں اور خدا کی مخلوق کو تر دماغ کرنے کے لئے کوسوں نکل جاتے ہیں۔

جُوئی اور بارش کا ننّھا قطرہ
(ایک مکالمہ)

جوئی۔ (ننھے قطرے سے) آؤ پیارے آؤ بیں دُکھیا تو ایک مدّت سے آنکھیں بچھائے تمہارا راستہ ہی دیکھ رہی تھی۔ اللہ! آج تک تم نے میری خبر نہ لی۔ توبہ توبہ! اتنی بے رُخی؟ اچھی بولو. بولو بتاؤ تو آخر تم اتنے دن سے تھے کہاں؟ مگر خیر جانے دو ان گلے شکوؤں کو۔ اب تو خوشی ہی خوشی کا سماں ہے۔ آؤ میرے پیارے۔ آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک۔ بس بس اب تو ساری دنیا کی خوشیاں میرا ہی حصہ ہیں۔

بیلا۔ (چنبیلی سے) دیکھتی ہو. بُوا اِس چھوکری کا دیدہ؟ اوئی پھٹکی پڑے ایسے چاؤ پر۔ وہ جو کہتے ہیں جس کی اُتری لوئی اُس کا کیا کرے گا کوئی؟ ہے ہے! ایک ننھا سا مینہ کا قطرہ کیا آگیا کہ یہ

بے شرم بے حیا جیسے دیوانی ہو گئی دیوانی - بلکہ اُوڈھل پڑی نوج بوا
اِس کا پرچھاواں بھی نہ پڑے کسی پر-

چنبیلی - ہاں بہن سچ کہتی ہو- یہ کس کا ذکر کر رہی تھیں تم ؟

بیلا - اے بوا- یہی جوئی - دیکھو تو یہ اتنی سی فِتنی ؟ اور یہ
بے شرمی ! میں تو حیران ہوں یہ کون سا وقت آگیا ہے ؟ تم نے
دیکھا نہیں ابھی ابھی ذرا دیر پہلے یہ کیسی مُنہ پھیلائے بیٹھی تھی کہ میں تم
سے کیا کہوں - اے لو آن کی آن میں بس جو ہیں کہ یہ مُوا بارش کا
قطرہ آکر گرا یہ ناشدنی کنواری کنیا آپے سے باہر ہو گئی -

چنبیلی -ہاں بوا کلجگ ہے یہ کلجگ - دوسرے یہ نادان!
کنواری بالی ہے نا- وہ کمبخت کیا جانے کہ اس سنسار میں یہ تو
کیا کوئی بھی اعتبار کے قابل نہیں -

جوئی - (پھر اپنی اُسی دُھن میں محو ہو کر) اچھی بولو پران ناتھ!
کیا تم اب تک مجھ سے خفا ہو ؟ آخر تم میری بات کا جواب کیوں
نہیں دیتے ؟

ننھا قطرہ - آہ پیاری - میں کیا بولوں ؟ میں بے قصور

ہوں۔ سراسر بے قصور۔ اصل میں مَیں اپنے اختیار میں نہیں ہوں۔ چاہے تمہیں یقین آئے یا نہ آئے! میں تو آج بڑی دیر سے یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اُڑ کر تمہارے پاس پہنچوں لیکن آہ تم نہیں جانتیں کہ ہم سب مینہ کے قطروں کو کیسی کیسی مجبوریاں ہیں، پیاری جوئی ہم قطروں کا آسمان سے ایک دم نیچے اترنا بیحد مشکل اور بڑا کٹھن کام ہے کیوں کہ اوّل تو ہم میں سے ہر ایک کو چھڑے دم آنے کا بوتا ہی نہیں اس لئے ہم سب اکٹھے ایک ساتھ اُترتے ہیں۔ دوسری مصیبت یہ ہے کہ سب کی طبیعتیں یکساں نہیں۔ ایک کہتا ہے ہم تو اوپر ہی اوپر ہوا کھائیں گے۔ نیچے کیا کریں گے جاکے؟ دوسرا کہتا ہے نہیں بھئی چلتے ہیں۔ ابھی تو نچلی تہہ ہوا کی بہت گرم ہے۔ ذرا ہوا اور ٹھنڈی ہو جائے جب چلیں گے۔ کسی کو ضد ہوئی ہے کہ واہ! وہاں سوائے ذلّت و خواری کے دھرا ہی کیا ہے؟ حق ناحق اپنی لعل سی جان گنوانے سے فائدہ؟

تیسرا کہتا ہے۔ اجی اِدھر تو دیکھو۔ آؤ اوپر چلیں۔ سورج کی شعاعوں کو ڈھونڈنے چلیں۔ ہم کو تو دھوپ کی چمک دمک

اچھی معلوم ہوتی ہے۔ چوتھا کہتا ہے نہیں بھئی سورج کے قریب جانا بھی ایک قسم کی موت ہے۔ چلو قوس و قزح یعنی دھنک میں چل کر آنکھ مچولی کھیلیں۔ کوئی بجلی کی شوخی کا دیوانہ ہے۔ وہ کہتا ہے دیکھو بجلی کو تو دیکھو۔ آہاہا۔ وہ کبھی اس بادل میں جگمگائی کبھی اُس ابر میں جا مچلتی ہے۔ اُف کیسی کڑکتی ہے۔ کتنی گرج ہے اس میں۔

جوئی۔ بجلی۔ بجلی۔ تو یہ کہئے! آپ سب بجلی کے عاشق ہیں۔ جبھی جبھی! آخاہ اچھی مجھ غریب سے دعوئے محبت محض ایک بناوٹ تھی بناوٹ۔ ہائے دغا۔ فریب۔ بہتان۔ تو یہ کہئے کہ آپ دراصل بجلی دیوی کے پروانے ہیں۔ جائیے جائیے تو تشریف لے جائیے۔ ہائے میری تقدیر ؎

بسر ہو جائے گی ہر طرح منعم خاکساروں کی
فقیروں کو غرض کیا ہے ترے خورشید منزل سے

قطرہ!۔ واہ رے بھولی مخلوق! ہائے میں نے کیا کہا اور تم کیا سمجھیں نہیں پیاری میں بوالہوس نہیں میں اس کینڈے کا فریبی نہیں ہوں جو ہرجائی کہلائے۔ آہ پیاری! میں صرف تمہاری

صورت کا پجاری ہوں ۔ ہائے تمھیں معلوم نہیں میں کیسے کیسے شدید انتظار کی گھڑیاں کاٹ کر آج کن مشکلوں سے تم تک سب سے پہلے پہنچا ہوں ۔ اصل میں میں ذرا بھاری بھرکم تھا اور سب ہلکے پھلکے وہ اوپر ہی رہ گئے ۔ دیکھتی نہیں ہو؟ یہ فقط تمھاری ہی کشش تھی جو مجھے آسمان سے زمین تک کھینچ لائی ہے ۔

کنولنی ۔ (پاس کے تالاب سے) واہ چھوٹے بھیا ۔ بھاری بھرکم اور تم ؟ آؤ ذرا اِدھر تو آؤ میں بھی تو دیکھوں ۔ تم کتنے بھاری بھرکم ہو ۔ آؤ ۔ آؤ میں تم جیسے سینکڑوں کو اپنے ایک پتے پر بٹھالوں اور پھر خبر نہ ہو ۔

قطرہ ۔ ارے یہ کون بولا ؟ کنولنی ؟ آخاہ ! چونی بھی کہے مجھے گھی سے کھاؤ ۔ چل بے شرم بے حیا ۔ اصل بات تو تو بھول ہی گئی ۔ شیخی باز کہیں کی کیوں ری اگر ہم نہ ہوتے تو تیرا یہ اتنا بڑا تالاب بھرتا کون ؟ یہ ہمارا ہی صدقہ ہے جو تو اس طرح اپلی گیلی اپنے پتوں کو پھیلائے بیٹھی ہے ۔ او کیچڑ کی بیٹی ڈوب مر چینی بھر پانی میں کمبخت پانی کے خاندان کو بٹہ لگا کر اب آپ سورج دیوتا کی عاشق زار

بننے چلی ہیں۔ چل نیچ کہیں کی۔

جوئی۔ اونہہ۔ جانے بھی دو یتیم یہ تم کس کے منہ لگتے ہو؟ جسے اتنی بھی شرم نہیں کہ ساری خلقت کے سامنے جدھر سورج جاتا ہے یہ احمق سڑن دیوانی بھی اُدھر ہی اُدھر چک پھریاں لگایا کرتی ہے۔ اسے تو اس کا بھی ہوش نہیں کہ کتنی مکھیاں۔ بھنگے اور بھونرے اس کی گندی چندیا پر منڈلایا کرتے ہیں۔

چنبیلی۔ ارے واہ ری دادی اماں تم بھی چڑ گئیں۔ سچ ہے ساری دنیا کا تجربہ تو بس ایک تمھیں پر ختم ہو چکا ہے۔ اری چھوکری بھلا مکھیوں، بھنگوں اور بھونروں کا آنا جانا کون سی ذلت یا بدنامی کی بات ہے۔

جوئی۔ دیکھو بڑی بی تم کتنی دیر سے برابر ٹر ٹر کر رہی ہو اور میں نے ایک کا جواب نہیں دیا۔ میں برابر جوتی اوندھائے خاموش بیٹھی ہوں۔

قطرہ۔ نہیں پیاری تم اپنے آپ کو دیکھو۔ یہ تم کس سے زبان ملاتی ہو۔ تم جیسی پری جمال نازک اندام کو ایسوں سے

بات کرنے میں بھی لاج ہے۔

کنولنی ۔ میاں فتنے ہوش کی لو ہوش کی ۔بس زیادہ بڑا بول نہ بولو جوئی ۔ نگوڑی تمہارے انھیں چھلا سڑوں پر تو ریجھی ہے مگر ہوشیار ہوشیار۔ وہ دیکھو ہوا کا تیز جھونکا کس شد و مد سے تمہاری مدارات کو چلا آتا ہے ۔ ذرا اُدھر تو دیکھو۔

جوئی ۔ (ہوا کے فرّاٹے کو آتے دیکھ کر) ہے ہے غضب یہ ظالم کہاں سے آگیا۔

قطرہ ۔ افسوس صد افسوس! لو پیاری خدا حافظ ۔ اب تو میرا ٹھیرنا یہاں ناممکن ہے۔

جوئی ۔ او خدا او خدا ہائے پیارے ۔میرے پیارے

کولنی ۔ لے لڑکی ۔ٹھیرا ۔ٹھیرا ۔ اب تُو اس اپنے چہیتے کو ٹھیرا ۔ موا تھوتا چنا باجے گھنا ۔

قطرہ ۔ لو پیاری اب میں چلا ۔

جوئی ۔ ٹھیرو ۔ خدا کے لئے ٹھیرو ۔ اجی نہ جاؤ! نہ جاؤ نہیں تو میں مرجاؤں گی ۔

قطرہ۔ ہائے ناممکن۔ قطعی ناممکن۔ اب تو میں مر کر بھی یہاں
نہیں ٹھہر سکتا۔

(ہوا کا جھونکا بالکل سر پر آجاتا ہی اور قطرہ کانپنے لگتا ہی)

جھونکا۔ او ننھی سی بوند تیری یہ مجال کہ تو ایسی پری جمال
نازنین پر ڈورے ڈالے۔

قطرہ۔ اجی۔ اجی جناب

جھونکا۔ بد نظر کمینے! جانتا نہیں۔ یہ بہار میرے لئے ہی
نہ کہ تجھ سے آوارہ مزاج کے لئے۔ تو اپنی اوقات دیکھ تو کھاری
پانی کا فضلہ۔ چل دور ہو یہاں سے۔ اس آسمانِ عیش پر تیرا
کوئی حق نہیں۔

قطرہ۔ مگر۔ مگر۔ میں تو اوپر آسمان سے آیا ہوں۔

جھونکا۔ چل چل۔ دفعہ دفعان۔ گندی موریوں میں ریتلی
زمینوں میں جذب ہو جا۔ جا غلاظت تیرا انتظار کر رہی ہی۔

جوئی۔ ہائے ظالم۔ خدا تجھے ہمیشہ پریشان ہی رکھے۔ ہائے
تو نے میرا عاشق مجھ سے چھین لیا۔ قطرہ گر پڑتا ہے۔

ہندوستانی

اے ہندوستانی بھائیو! اے ہندو مسلمانو! سکھ۔ یہودی عیسائیو! اس وقت اس عالم میں جب کہ زندہ اور کام کرنے والی قومیں نت نئی ایجادوں کے دریا بہا رہی ہیں۔ آپس میں مِل جُل کر صدہا میل کا سفر طے کر کے صعوبات زمانہ اُٹھا اُٹھا کر رائی سے پربت اُٹھانے کو تیار ہیں۔ انسان بے پر کا حیوانِ ناطق آسمان پر اُڑا اڑا پھرتا ہے۔ ہوا۔ پانی۔ بجلی کوئی چیز ایسی نہیں جو اُس کی محکوم نہ ہو۔ زمین تو زمین آسمانی ستاروں میں وہ اپنا پیغام پہنچانا چاہتی ہیں۔ آلات حرب کو ترقی دے کر طرح طرح کے انسانی قاتل پیدا کر کے وہ زہریلی گیسیں ایجاد کی ہیں جن سے آناً فاناً میں شہر کے شہر ویران ہو جائیں بستیاں کی بستیاں ایسی تاراج ہو جائیں کہ جن میں ہست و بود کا سان و گمان بھی

کبھی نہ ہو۔ آہ ایسے وقت میں ایسے ترقی خیز دن رات میں اے بدبخت ہندوستانیو تم آپس میں خونریزیاں کرکے ناخنوں سے گوشت جدا کر رہے ہو جو کچھ بھی تمہارا دین و مذہب ہو جو مادہ یا روح تمہارے لئے واجب التعظیم ہے یا جس قوت کو اپنے سے بڑا سمجھتے ہو تمہیں اسی کی ذات کی قسم۔ ایک لمحہ سوچ کر بتاؤ؟ کیا تم انسان ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہو؟ آج ہندوستان کا کوئی ایسا خطہ نہیں جہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہی لہر نہ ہو جو بنی آدم کو اپنے ہم جنس کو اور اپنے ہی جیسے گوشت پوست اور استخوان والے حیوان ناطق کو خاک و خون میں ملانے پر کمربستہ نہ ہو۔

کہیں کسی پرستش گاہ پر آپس میں جھگڑا ہے۔ کہیں گائے بیل۔ باجا گاجا تم لوگوں کا موجب فتنہ و فساد ہے کہیں ڈھول ڈھماکا۔ بانسری۔ لیکچر ایک دوسرے کے لئے باعث رنج ہے افسوس صد افسوس بھائیو! ایک ذرا کی ذرا سنجیدگی کے ساتھ تامل کرو۔ یہ نقصان جان و مال ایک دوسرے کی ذلت و خواری۔

نہیں بتاؤ دوسرے ملکوں کے مہذب انسانوں میں تمہاری کیسی تھڑی تھڑی کرتی ہوگی۔

آہ! یہ سب آخر کس لئے؟ شائد اس لئے کہ تم میں سے ایک گروہ دوسرے سے کہتا ہے کہ تو کیوں اتنا ستی ستیا بنتا ہے؟ تجھے کوئی حق نہیں کہ تو میری ہوا میں سانس لے یا میرے آسمان کے نیچے پاؤں پھیلائے۔ میں یہاں کا قدیم باسی ہوں۔ میرا دھرم پُرانا اور پوتر ہے۔ میں قرنوں سے یہاں بود و باش رکھتا ہوں دوسرا کہتا ہے یہ سب غلط ہے۔ یہاں تیرے سوا تجھ سے بھی قدیم مخلوق رہتی ہے۔ یہاں کی ہر چیز حادث ہی کوئی قدیم نہیں میرا مذہب عین فطرت ہے۔

میرے عزیز ہم وطنو! یہ فقط زمانے کا انقلاب ہے جس نے آج ایک بیرونی طاقت کو ہم پر حاکم بنا دیا ہے۔ خدا کا کوئی مذہب نہیں ہے اور مذہب کی آڑ میں وطنیت کو تباہ کرنا ہماری انتہائی بدنصیبی ہے۔ خدا تو وہ کریم ہے کہ یہود و گبر و نصارا سب کو وہ یکساں رزق پہنچاتا ہے۔ یہاں تک کہ جو اس کو نہیں مانتا اُس

کی روزی کے لئے بھی اُس کے یہاں کمی نہیں۔ خدا کے نزدیک جیسے زرد چینی ہیں ویسے ہی افریقہ کے سیاہ حبشی۔ اسی طرح یورپ کے سرخ وسفید۔ یہ امتیازِ نسل ورنگ تو خود ہماری اختراع ہے اس کے نزدیک تو سب یکساں ہیں۔ سورج کو ہی دیکھو کسی خاص تاریکی کو روشن نہیں کرتا بلکہ ہر خشک و تر پر اس کی کرنیں یکساں جگمگاتی ہیں۔ آسمان کا پانی چاند ستارے ہوائیں۔ بادل۔ آگ۔ مٹی، غرض کونسی چیز ہے کہ جو مشترک فائدے نہ دیتی ہو۔ اے ہندو مسلمانو! اے بھارت کے نامبارک سپوتو! کتنی بدبختی ہے کہ ایک زمین پر رہ کر، ایک خاک سے پیدا ہو کر، ایک ہوا میں سانس لے کر ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوئے جاتے ہو؟ ہمارے سامنے مغرب کی مثال ہے۔ یورپین ممالک میں بھی ہمارے بھارت کی طرح مختلف مذہب کے لوگ بستے ہیں وہاں بھی تفریق مذہب کی دُوسرا ہٹیں موجود ہیں۔ میاں رومن کیتھولک ہے تو بیوی پروٹسٹنٹ باپ یہودی ہے تو بیٹا بورہ لیکن با ایں ہمہ وہ ایک گھر میں رہتے سہتے ہیں، ایک میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ ایک دیوان خانے میں

بیٹھ کر اپنے اپنے مشاغل پر ہنستے بولتے ہیں۔ کام کے وقت کام اور سیر کے موقع پر سیر و تفریح۔ کیا مجال جو کسی وقت مذہبی مغائرت کا نام بھی آجائے۔ صبح ہوئی نہائے دھوئے۔ چائے پانی اکل و شرب سے فرصت پائی۔ گاڑیاں، بائیسکلیں۔ موٹریں دروازے پر آ لگیں بیوی نے اپنی کتاب میز پر سے اٹھائی۔ میاں نے اپنی اور دونوں ایک گاڑی میں ہنستے بولتے چلے گئے۔ وہ اپنے گرجا میں چلا گیا۔ یہ اپنے معبد میں۔ نہ لڑائی نہ جھگڑا عیسیٰ بدین خود موسیٰ بدین خود۔

بڑھو ورنہ کچل ڈالے جاؤگے

یہ ہنگامہ خیز دنیا۔ یہ زندگی کا تلاطم۔ ایک بڑی گزرگاہ ہے۔ جس میں ایک ہی نکتے پر ہزاروں قدم بڑنے کو تیار ہیں۔ صبح۔ شام گھڑی۔ ساعت۔ پل۔ سانحہ بلکہ ایک ایک سانس پر ہر ہستی میں جدو جہد ہو رہی ہے اور ایک کو پسپا کر کے دوسری ہستی اپنی جگہ لینی چاہتی ہے۔ اگر غور کرو تو یہ ہے خاموش مقابلہ یہی نہیں بلکہ قانون قدرت بھی ایسا ہی ہے۔ اس لئے یا تو تم خود بڑھو یا دوسروں کو بڑھنے دو۔ ایک جگہ کھڑے رہنے کا دھرم نہیں ورنہ اور تمہارے سر پر پانوں رکھ کر آگے نکل جائیں گے جس طرف نظر اُٹھاؤ یہاں ہر طرف مقابلہ کا بازار گرم ہے۔ جہان کی زبان بے زبانی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اے جاندار مخلوق بڑھو بڑھے جاؤ۔ ورنہ دوسرے زبردست لوگوں کو رستہ دو۔ یہاں

کی کسی چیز کو قیام نہیں ۔ کوئی ذرہ حرکت سے خالی نہیں ۔ تم بھی حرکت کرو ۔ قدم استوار رکھو اور آگے بڑھے چلے جاؤ ۔ ورنہ دوسرے تمہیں گرا کر آگے بڑھیں گے اور ان کے لئے پھر آگے مقابلے کا میدان موجود ہے ۔ دیکھو ایک ڈالی ایک ٹہنی میں دو پھول نشوونما پائے کھلے اور کھل کر مرجھا گئے ۔ یہ درجہ بدرجہ صورتیں بدلنا ہی ان کا بڑھنا ہے وہ بھی بڑھتے ہیں اور دوسرے ان کی جگہ لیتے چلے آتے ہیں ۔ ایک کلی کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری کھلی ۔ مرجھائی اور پھر گر پڑی ۔ پھر خاک میں مل کر اس کا دوسرا دور شروع ہو گیا ۔ اُسی طرح سورج ڈوبا ۔ رات ہوئی موجوداتِ عالم خاموش طریقے سے بدلنے لگے کہ بیداریوں کا پہرہ آیا اور صبح ہو گئی ۔ دھوپ چڑھی ۔ سایہ بڑھا ۔ صبح، دوپہر تیسرا پہر برابر ایک دوسرے کی جگہ لیتا گیا یہاں تک کہ پھر شام ہو گئی اس لئے کس طرح ممکن ہے کہ تم دنیا میں رہ کر زندہ کہلا کر ایک ہی جگہ کوئیں کے مینڈک بنے پڑے رہو ۔ نہیں نہیں ہرگز نہیں ۔

یہ ترقی خیز دنیا ہے ، یہ حرکت کا زمانہ ہے اور قسم قسم کی روشنی اپنا کام کر رہی ہے ۔ بس اگر تم میں قابلیت ہی اگر تم میں ذرا بھی قوت ہے ، اگر تم مضبوط اور مستقل مزاج ہو تو مردانہ وار جد و جہد و کرد اور قدم استوار رکھتے ہوئے دوسروں سے جگہ چھینتے آگے بڑھتے چلے جاؤ اور زندگی کی دوڑ میں نام آور کہلاؤ ۔ ایک سانس ایک لمحہ کہیں نہ ٹھیرو ورنہ مقابلے کے بازار میں کوئی تمھاری رعایت نہ کرے گا اور خدا کی زمین میں بڑھنے کے لئے فقط تمھارا ہی حق نہیں رکھا ہے۔

پوشیدہ

یاد بخیر، یہ جوانی دِوانی کے وہ متوالے نقوش ہیں
جو اب بھی جب کبھی یاد آجاتے ہیں تو بے اختیار کلیجے میں
ایک ہوک اُٹھتی ہے اور الف لیلہ کا وہ فقرہ یاد آجاتا ہے
بلکہ ہر دفعہ گھنٹوں وہی فردوس نظر تصور بندھا رہتا ہے کہ "ایک
دفعہ دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے" یہ مدت مدید
کا واقعہ ہے جب کہ پرنیا (بنگال) کی ریاست کھیگڑہ میں بحیثیت
نگرانِ کار قدرت نے مجھے اوصاف باغ میں مقیم کر دیا تھا۔
یعنی ان دنوں منیجر ریاست جو کہ ایک بیرسٹر صاحب تھے،
ان کی خاص نگرانی اور ریاست کی خفیہ خیر خبر میرا فرض تھا
اس لئے وہاں کا تمام عملہ دخلہ مجھ سے بہ تکریم پیش آتا تھا۔
یہ اوصاف باغ جہاں میں اپنے ایک نوجوان رفیق کے ساتھ

ایک بیچلر کی حیثیت سے رہتا تھا، ریاست کا بہترین باغ تھا جس میں صد ہا قسم کے شاہ پسند آم کے درخت تھے جو اپنی فصل پر بہشت ارضی کا لطف دیتے تھے، اسی باغ کے ایک قطعہ میں ناگیسر کے دو درخت بھی ایسے تھے جن میں کا شہد نہایت لطیف اور خوشبودار ہوتا تھا۔ باغ کے وسط میں ایک پھونس کا بہت بڑا انگریزی وضع کا بنگلہ بھی تھا جس کے گرد قسم قسم کے پھولوں کے تختے رات دن لہکتے رہتے تھے۔ ایک باورچی دو چپراسی۔ ایک دُنالی ہیمرلیس بندوق بس یہ ہمارا گرد و پیش تھا۔ کبھی کبھی ریاست کے منیجر صاحب بھی مزاج پرسی کے طور پر میرے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ ریاست کھیگڑہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں ہم رہتے تھے، جس کا صرف ایک ہی لمبا لہکارا بازار تھا نہ عمارتیں نہ باغات نہ مدرسے نہ سڑکیں۔ نہ گاڑیاں نہ گھوڑے۔ بالکل سنسان جنگل بیابان، ایک نہایت منحوس سی بستی تھی۔ غرض یہاں پر بہ ہزار مشکل مجھے چار مہینے گزرنے پائے تھے جو یکایک لاہور سے ایک تار میرے رفیق قمرالدین

کے نام آیا کہ تمہاری ضعیف ماں پر پھر دورہ پڑا ہے۔ اگر تمھیں ان کا منہ دیکھنا ہے تو جلد سے جلد لاہور پہنچو۔ تار کیا تھا ایک بلائے مبرم تھا جس کے آتے ہی قمرالدین نے سو روپیہ کا فوراً مطالبہ کیا۔ دوسرے دن میں نے منیجر صاحب کو چٹھی بھی لکھ دی کہ میرے حساب میں سو روپیہ حامل رقعہ ہذا کو دیدیا کہ وہ اپنے وطن جا رہے ہیں۔ غرض اس طرح سے قمرالدین بھی لاہور چلے گئے، اور میں بدبخت بیک بینی و دو گوش اسی اوصاف باغ میں بالکل تن تنہا رہ گیا۔ اُف پناہ بخدا۔ وہ گرمی کا موسم۔ وہ اکیل پن۔ وہ نہ آدمی نہ آدم زاد۔ ایک ہُو کا مقام۔ چارو ناچار جس وقت شام کا وقت ہوتا اور ذرا ٹھنڈی ہوا چلتی تو میں وہیں ناگیسر کے درختوں کے نیچے میز کرسیاں بچھوا لیتا اور دو گھنٹے کامل روتا رہتا۔ یہ دونوں درخت نہایت سرسبز تھے اور ان کے پتّے مجھے اس وقت بھی کچھ خوشبو لئے معلوم ہوتے تھے۔ بس تمہید ختم اب میں اپنی داستانِ شروع کرتا ہوں سننے والے ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر

نہیں۔ یہ لفظ لفظ واقعہ ہے واقعہ۔ بناوٹ یا افتراع یا تصنع کا کہیں ذرہ بھر نام نہیں۔ وہ سننے والا سن رہا ہے اور میں کہنے والا بے کم وکاست کہہ رہا ہوں۔

غرض قمرالدین کے جانے کے بعد ایک دن شاہوں شام میں اسی ناگیسر والے قطعے میں دیر تک نہایت بے قرار ہو کر اپنے حال زار پر روتا رہا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بار بار میں اس خلاق عالم سے یہ استغاثہ کر رہا تھا کہ اے پروردگار نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ میرا ایک رفیق تھا وہ بھی یہاں سے کوسوں دور جا بیٹھا۔ حضرت آدم نے اولوالعزم پیغمبر ہو کر جب اس روح فرسا تنہائی کو پسند نہ کیا اور تیری درگاہ میں اپنے ہم جنس کی تمنا کی تو میں تو ایک گنا ہوں۔ یا الٰہی مجھ پر رحم فرما۔ یہ کہتے کہتے کچھ مجھے تسکین سی ہو گئی اور میں اپنے آنسو دالنسو پونچھ کر کرسی سے اُٹھنے ہی کو تھا جو یکایک قوی ہاتھ میری پشت پر پڑا اور ساتھ ہی یہ الفاظ بھی مجھے سُنائی دیئے۔

ہیں ؟ کیا آپ رو رہے ہیں۔ بھئی واہ آپ تو بڑے

بزدل نکلے۔" مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ الفاظ ہمارے منیجر صاحب فرما رہے ہیں۔ آخر مجھے وہاں سے اُٹھا کر کشاں کشاں اندر بنگلے میں لے گئے۔ میرا ہاتھ منہ دُھلوایا۔ کپڑے بدلوائے اور باکراہ تمام انھیں کی گاڑی میں بیٹھ کر اسی قصبے اسی گاؤں کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے۔ یہ قصبہ کیا تھا بدتر سے بدتر دیہات کا نمونہ نہ ہاٹ نہ بازار۔ بانسوں سے ڈھکا ہوا۔ سرکیوں سے پٹا ہوا۔ ٹین کی چادروں سے چھپا ایک میدان تھا میدان۔ جس میں کہیں غلے کے ڈھیر کہیں کپاس کے بورے جہاں تہاں زمین پر بکھرے پڑے تھے۔ اسی لمبے لہکارے میدان میں جھٹ پٹے کے وقت ایک گھوڑے کی ٹمٹم ہمیں لئے ہوئے آہستہ آہستہ وہاں سے گزر رہی تھی، ہمارے پیچھے پچھلی سیٹ پر ان کا ایک تحصیلدار بیٹھا تھا۔ گاڑی خود بیرسٹر صاحب ہانک رہے تھے اور میں ان کے برابر بیٹھا ہوا اِدھر اُدھر دیکھتا جا رہا تھا۔ اتنے میں بیرسٹر صاحب بولے یہ کیا ہے جی، آپ تو عجب مزاج کے آدمی نکلے؟ اس طرح تو روتے روتے آپ کسی

دن اپنی جان دے دیں گے اور ہمیں خواہ مخواہ نواب صاحب کو یہ لکھنا پڑے گا کہ وہ میر منشی صاحب وہ ہمارا آفیسر یا نگرانِ کار، عالمِ تنہائی کی نذر ہوگیا۔ مردِ آدمی بھلا اس طرح بھی کوئی اپنی جان ہلاک کرتا ہے؟ ہیں۔ بیرسٹر صاحب آپ بھی بجا فرماتے ہیں۔ بے شک میں ایک دیوانہ آدمی ہوں آہ آہ میں آپ سے کیا عرض کروں کسی کام میں کسی وقت جی نہیں لگتا۔ کوسوں ہم جنس کی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ خصوصاً یہاں رات کو شیر لگتا ہے۔ رات کیا آتی ہے کہ خطرات کا ایک طوفان اپنے ساتھ لاتی ہے۔ صرف دو چپراسی اور ایک بچارا باورچی اور ایک میں۔ بس لے دے کے یہ چار دم ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے ان لوگوں سے کس طرح میں ہم بزمی کی خدمت لے سکتا ہوں۔ دوسرے وہ سب حقہ پیتے ہیں اور میرا حقّے سے دم نکلتا ہے۔ پھر آخر کہاں جاؤں اور کس کے پاس بیٹھوں؟ ہائے بیرسٹر صاحب یہ باغ، یہ آموں سے لدے ہوئے درخت، یہ

پھول، یہ پھلواری بغیر کسی ہم جنس کے میری نظر میں تو خار زار ہی خار زار۔

بیرسٹر صاحب۔ کیا خوب؟ تو آپ کی خاطر سے ریاست کو ایک ہم نشیں ایک ہم جنس بھی مہیا کرنا چاہیئے۔ بھئی وا۔ لاد دو لدا دو، اور لادنے والا بھی ساتھ کر دو۔ عقل کے ناخن لیجئے حضرت۔ اتنی نازبرداری تو ہم نے کہیں بھی کسی کی نہ دیکھی نہ سنی۔

میں۔ خیر صاحب پھر نہ ہو۔ میں نے نوکری کی ہے کچھ اپنی جان نہیں بیچی۔ چاہے کچھ بھی ہو اب میں بغیر کسی دُسراہٹ کے یہاں کھڑا پانی بھی نہ پیوں گا۔

بیرسٹر۔ (مذاق سے) اچھا صاحب چلو آج ہم یہیں سے اسی کوردہ میں سے ابھی ابھی ایک دل خوش کن ندیم آپ کے لئے تلاش کر دیں گے۔ چلو آگے تو بڑھو۔

میں۔ جی کیوں نہیں، یہاں تو صدہا کلب۔ صدہا انجمنیں اور دل لگیاں موجود ہیں۔ آپ جہاں سے چاہیں گے یہ فقرا

میرا ابھی تمام بھی نہ ہونے پایا تھا جو بازار کا آخری حصہ ختم ہو گیا اور وہیں ایک ٹین کے سائبان کے نیچے دیکھتا کیا ہوں کہ ایک حیرت انگیز چیز دُنیائے حسن کا بہترین مجسمہ ایستادہ تھا۔ ایسی غیر معمولی دل فریب صورت۔ اس حیرت انگیز لباس میں ملبوس۔ بس اس مخلوق غیبی کا دیکھنا تھا کہ میں نے منیجر صاحب کو آہستہ سے ٹہوکا دیا۔ اُنھوں نے میری طرف دیکھا پھر میرے اشارے کے مقام پر نظر کی اور پیچھے مُڑ کر اسی وقت اپنے تحصیلدار کو آہستہ آہستہ حکم بھی دے دیا کہ دیکھو جی ان صاحب کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ میں شمپینی لے کر حاضر ہوتا ہوں اگر وہ آمادہ ہو جائیں تو انھیں اوصاف باغ میں دعوت دے کر اپنے ساتھ ہی لیتے آؤ۔ سمجھ گئے نا؟

یہ سُنتے ہی تحصیلدار بیچارہ بھی چپ چاپ گاڑی سے اُتر گیا اور ہم دونوں نہایت خوش خوش اسی نعمت غیر مترقبہ کے تذکرے کرتے پھر اوصاف باغ واپس آ گئے، دوسرا چپراسی صاحب کی گاڑی لے کر اصطبل چلا گیا اور باقی دو

آدمیوں سے ہم نے بنگلے کے برآمدے میں کرسیاں بچھوائیں میز لگوائی ۔ بجلی کا پنکھا چلنے لگا ۔ اور تھوڑی سی دیر بعد تمام اکل وشرب کے سامان سے آراستہ وہیں ایک لمبی میز بھی سجادی گئی ۔ پھولوں کے گلدستے بھی باقاعدہ اٹھوا منگائے ۔ اب ہم دونوں شاداں وفرحاں اس بڑی میز پر جا بیٹھے ۔ تقریباً ایک گھنٹہ شدید انتظار میں اور گذرا جب کہ منیجر اپنا ہیٹ ہاتھ میں لئے بار بار اُٹھتے اور پھر تن کر بیٹھ جاتے تھے ۔ اتنے میں میرے باورچی نے ایک نئی قسم کی بھنی ہوئی مچھلی لاکر سامنے رکھ دی ۔ مینائے عیش کھل گئی ۔ میں اور منیجر صاحب ایک ایک چسکی لگاکر گنگھنگیر بھی کرنے لگے جو یکایک باغ کا بڑا پھاٹک کھلا اور بیلوں کی بند گاڑی جسے وہاں شمپنی کہتے ہیں چھم چھم کرتی اندر داخل ہوئی ۔

منیجر ۔ ارے واہ بھئی وا ۔ واقعی تم بڑے نصیبے والے ہو ۔ آہا ہا آگئی وہ خوبصورت گجری آگئی ۔ سامنے سے

وہی تحصیلدار آتا ہوا دکھائی دیا۔ اور گاڑی عین بنگلے کے سامنے آکر ٹھیر گئی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب میں اپنے ہوش میں نہیں تھا، میرا سارا جسم مارے رعب کے تھرّا رہا تھا۔ اِدھر منیجر صاحب بھی خود بخود ہیٹ لے کر کھڑے ہو گئے تھے اور میں نے آگے بڑھ کر ایک سرو نوخاستہ کو ہاتھ تھام کر گاڑی سے اُتار بھی لیا تھا۔ آہ وہ چنبیا جیسی رنگ والی حور عین بالکل اس وقت رام تھی، قطعی بے تکلف، غنچہ کی طرح ہنستی مسکراتی، شاداب۔ کلی کی طرح مہکتی چٹکتی کچھ اس چال سے برآمدے میں چڑھ آئی کہ سچ مچ کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہا۔ اللہ اللہ میں اب تک نہیں سمجھا کہ وہ کون مخلوق تھی، کہاں سے آئی تھی اور کیونکر آئی تھی؟

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

اور پھر اتنی بے تکلف جیسے کہ کوئی برسوں کا جانا بوجھا ہوتا

ہے۔ بالکل اُسی طرح وہ ہنستی اٹھلاتی آگے بڑھی۔ ایک غلط انداز نظر ہم دونوں پر ڈالی اور نہایت بے دردی سے منیجر صاحب غریب کی طرف اشارہ کیا۔ ہیں یہ کون ان سے کہئے کہ یہ یہاں سے چلے جائیں۔

منیجر صاحب گویا مسحور تھے۔ اُنھوں نے سُنا اور فوراً اطاعت کی۔ آہستہ سے اپنی ٹوپی میز پر سے اُٹھائی اور لڑکھڑاتے ہوئے برآمدے سے نیچے اُتر گئے۔ معاذاللہ، پناہ بخدا۔ حالانکہ وہ الفاظ منیجر صاحب کے لئے نہایت دل شکن تھے۔ مگر اُنھوں نے سانس تک نہ لیا اور بید ہلاتے ہیٹ سر پر رکھے چپ چاپ وہ وہاں سے نکل گئے درا صل پوشیدہ کے یہ الفاظ اس وقت مجھے بھی نہایت ناگوار گزرے مگر اُس اُبی ہوئی شمشیر کے رُعب سے میں نے اس معاملے میں درک نہیں دیا۔ بلکہ کہا تو صرف اتنا:۔

میں۔ ماشاءاللہ آپ تو بہت ہی اچھی اُردو بولتی

ہیں۔ اس کو ردہ اور خاص کر بنگال میں رہ کر اور خیر سے بے باک بھی ہیں۔ مگر اتنا نہیں چاہیئے تھا۔

پوشیدہ۔ اُف، ہوسکتا ہے (یہ گویا اس مخلوق کا تکیہ کلام تھا۔) مگر آپ سے بڑھ کر نہیں۔ آپ اُردو بھی مجھ سے بہتر جانتے ہیں اور بے باک بھی انتہا سے زیادہ کہ بعض اوقات اپنے رب اور اپنے پیدا کرنے والے سے بھی نہیں ڈرتے۔

توبہ توبہ قائل کا یہ آخری جملہ سنتے ہی میرا دل لرز گیا۔ فی الواقعی مجھ پر ایک دہشت سی طاری ہو گئی۔ میں۔ (کچھ تامل کے بعد) بہت اچھا آپ جو چاہیں فرمائیں لیکن منیجر صاحب کے ساتھ ایک مہمان کے ساتھ اتنی سختی نہ کرنی چاہیئے تھی؟

پوشیدہ۔ (مسکرا کر۔ آہ جیسے کلی کھل گئی۔ وہ ننھا سا دہانہ کھلتا یا حرکت کرتا ہوا بھی نہ معلوم ہوا) مہمان! مہمان سب ہیں، میں ان کا کوئی دیا کھاتی

ہوں۔ مطلب صرف آپ سے ہے۔ اور اگر آپ نہیں چاہتے ہیں تو میں انھیں بُلا لیتی ہوں۔

یہ سُننا تھا کہ میری جیسے جان ہی تو نکل گئی اور میں اپنی حالت کا دل ہی دل میں اندازہ کرتے ہوئے، جی نہیں جی نہیں! یہ میرا مقصد نہیں۔ آپ کے تشریف لانے سے تو میں نے گویا دوبارہ زندگی پائی ہے۔ میں اپنی تقدیر پر جس قدر بھی نازاں ہوں کم ہے۔ بھلا آپ جیسی آسمانی حور اور مجھ جیسا نالائق یہ محض اس کی کریمی ہے، جس نے یہ کرم کیا۔

پوشیدہ۔ اُف، ہوسکتا ہے، اچھا یہ کیا چیز ہے (جنس ممنوعہ)

یہ دو لفظ سُنتے ہی میں سکتے میں رہ گیا اور اُنھوں نے نہایت بے باکی سے پھر یہ کہنا شروع کیا:۔

"آپ کے پاس گھڑی ہے؟"

میں نے کہا اندر کمرے میں ہے۔

اچھا تو تین بجتے ہی شمینی کو حکم دیجئے کہ ہمیں واپس لے جائے ، مگر جانے سے پہلے ہم ایک دفعہ غسل بھی کریں گے۔

اب میں بالکل بے خود تھا۔ اُنھوں نے گلاس اٹھاکر خالی کر دیا۔ اور دوسرے منٹ پر دوسرا گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ اس کے بعد ہم دونوں برسوں کے پُرانے دوست تھے۔ ہائے وہ رات کس قدر مختصر ہوگئی۔ کیونکہ جب ہم نے کھانے سے فراغت پائی اور دونوں نے ہاتھ دھوئے تو اندر کے کلاک نے بارہ بجا دئیے۔ اب میں ان کا ہاتھ پکڑ کے باغ میں لے گیا۔ وہاں کا سبزہ۔ وہاں کی بیلیں ، میوے دار درخت ، خوشبودار درخت غرض چپہ چپہ اتنا حسین معلوم ہوتا تھا جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کے تنفس سے مجھے چلیا کے تازہ پھولوں کی خوشبو آتی تھی اور ان کا شباب مجھے ایک ترشی ہوئی مرمریں مورت سے بھی بہتر معلوم ہوتا تھا۔ تمام رات میں اُنھوں نے صرف دو جام پیئے اور

پھر میرا مہمان مجھے کھینچ کر خود اس ناگیسر والے تختے میں لے گیا۔

پوشیدہ۔ کیوں جی تم یہاں بہت بیٹھا کرتے ہو؟ میں ڈر کے مارے قریب تھا کہ نامردوں کی طرح کانپنے لگوں جو اُنھوں نے مُسکرا کر پھر کہا۔ آپ اتنا ڈرتے کیوں ہیں دیکھئے صاحب، ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ رویا نہ کریں۔ میں پھر ذرا گھبرایا تو۔

پوشیدہ۔ نہیں نہیں۔ آپ کا وہ دوست جو یہاں سے چلا گیا ہے وہی بازار والوں سے اس طرح کہا کرتا تھا کہ آپ اکیل پن کے مارے ہمیشہ اُداس نہایت اداس رہتے ہیں۔

میں۔ ہاں بے شک اُس شخص کے جانے سے مجھے اکیل پن کی نہایت سخت اور شدید تکلیف ہے مگر اُس خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے آج وہی کنج تنہائی ایک ایسی حورِ بہشتی کی تشریف آوری سے بہشت بریں کا مماثل

کر دیا۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔

پوشیدہ۔ اُف ہو سکتا ہے، خدا آپ کا بھی بھلا کرے۔ کیوں کہ آپ بے ماں کے لال ہیں۔ آپ کی ماں کے ساتھ دنیا اور دنیا والوں نے حد درجہ ظلم کیا تھا۔ مگر ہیں ہیں آپ پھر بدحواس ہو چلے۔ ارے صاحب مظلوم اور ظالم گو اس وقت قدرت کے دربار میں ہیں۔ مگر وہ خدا تو کسی پر ظلم نہیں کرتا اور نہ رتّی برابر اس کی طرف سے ظلم ہوتا ہے۔ یہ سب ہمارے آپ کے مظالم ہیں۔ آپ کا وہی رفیق مجھ سے سارا قصہ کہہ چکا ہے۔

میں۔ آپ سے؟ میرا وہی رفیق۔ کیا قمر الدین۔ قمر الدین؟

پوشیدہ۔ خدا آپ کا بھی بھلا کرے۔ جس نے اتنے دن یہاں رہ رہ کر اور رو رو کر رحمت الٰہی کو موجزن کر دیا اور ہم کو آپ کی دلداری کرنی پڑی۔ بس قریب تھا کہ اس فقرے پر میری عنان صبر ہاتھ سے نکل جائے جو انھوں

نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگاکر پھر کہا، نہیں نہیں۔ بات یہ ہے کہ آپ جیسے ستم رسیدہ لوگوں کی خبریں اکثر جابجا مشہور ہو جاتی ہیں۔ خواہ وہ آپ کے قمرالدین کی زبان سے ہوں یا کسی اور کی۔

میں۔ تو آپ۔ آپ؟

پوشیدہ۔ میں بھی یہاں تازہ وارد ہوں۔ رہتے بھتے کسی نہ کسی سے میں نے بھی یہ سُن لیا۔

میں۔ مگر سُنیئے تو۔ یہ آپ میں سے اس قدر خوشبو کس چیز کی آتی ہے؟ اور، اور آپ اس درجہ حسین مہ جبین سراپا ناز کیوں کر واقع ہوئی ہیں اور پھر ایسی شستہ و رفتہ زبان آپ نے کہاں سے حاصل کی ہے، اور، اور خدا کے واسطے اتنا ضرور بتادیں کہ آپ کا نام کیا ہے، نام؟

پوشیدہ۔ (قہقہہ لگاکر) آخاہ۔ اکھٹے اتنے سوال؟ اب میں الگ الگ جواب دوں یا جامع طور پر؟ دیکھو صاحب۔

جمال ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ ما ہمہ خاکم کہ ہستم

میں ۔
کیا ضد ہے گلا تیغ پہ دھرنے نہیں دیتے
جینے نہیں دیتے مجھے مرنے نہیں دیتے

پوشیدہ ۔ آپ کی باتیں بھی عجیب و غریب باتیں ہیں۔ ارے صاحب آپ ہی جیسے لوگوں کی عنایت سے ہم لوگ بھی بولنے بات کرنے کے قابل ہو گئے ۔ بلکہ ہر زبان میں تھوڑا بہت درک رکھتے ہیں ۔

میں ۔ ہیں ہیں ہر زبان میں ؟

پوشیدہ ۔ کیوں یہ کون سا کمال ہے ۔ آج کل سائنس اور حکمت کے چشمے بہہ رہے ہیں ۔ اگر ایک شخص بہت سی زبانیں بھی جانتا ہے تو یہ کون سی ان ہونی بات ہو گی۔

میں ۔ اچھا تو کم سے کم آپ مجھے اپنے نام سے تو محروم نہ رکھیں ۔ نام سے کیا کل پھر آپ تشریف لا سکتی

رہیں ؟

پوشیدہ - کل - واہ کل کی کسے خبر ہے ؟ اور نام. میرا نام اس سے آپ کو کیا فائدہ ؟

میں - ہاں فائدہ ہے - ہمیں فائدہ ہے کچھ -

پوشیدہ - اُف ہو سکتا ہے - اچھا تو سنئے نام میرا ہے پوشیدہ - بالکل پوشیدہ ، اتنا کہہ کر وہ کھلاکر ہنس پڑیں اور مجھے پھر ایک ایسی نظر سے دیکھا کہ میں مبہوت ہو گیا -

آہ ، آہ ، وہی بزدلی اور ڈر مجھ پر پھر مسلّط ہو گیا. دو بجے کے بعد شمینی کوئی خود بخود لے آیا - اب مجھے کچھ ہوش نہ تھا - وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر بنگلے میں لائیں - تولئے صابن سب چیزیں غسل خانے میں رکھیں تھیں - وہ فوراً غسل خانے میں چلی گئیں اور وہاں سے نہا دھو کر لمبے بالوں کی نقاب چہرے پر ڈالے آفتابِ صبح کی طرح برآمد ہوئیں ، تو میں ان کے گرد پھرا اور جب

وہ جاکر شمپنی میں بیٹھ گئیں تو مجھے یہ بھی بات جچ گئی کہ یہ کوئی آوارہ مزاج پنچھی ہیں جن کی معاش شائد دلوں کی خریداری ہی ہو اس لئے میں اپنے چھوٹے کمرے میں جہاں کیش بکس رکھا تھا وہاں گیا۔ مجھے خوب یاد ہے اس وقت کل ساٹھ روپئے بکس میں تھے۔ میں نے پچیس روپئے اس میں چھوڑ دئے اور باقی پینتیس ۳۵ روپئے نکال لایا اور ان کے قریب جاکر وہ حقیر رقم آگے کر دی

پوشیدہ۔ ارے یہ کیا اُف بڑا دل کیا۔ اور وہ پچیس روپئے وہیں چھوڑ دئے۔ یہ سنتے ہی قریب تھا جو میں خوف کے مارے کھڑے قد سے گر پڑوں۔ مگر انھوں نے میک اپ کیا۔

پوشیدہ۔ نہیں نہیں آپ گن رہے تھے نا۔ اس لئے میں نے روپیوں کی آواز پر کان لگا دئے تھے۔ لو یہ اپنے ہی پاس رکھو۔ اچھا خدا حافظ۔ اس کے بعد شمپنی ہوا کی طرح چھم چھم کرتی نظر سے اوجھل ہو گئی۔ دوسرے دن

علی الصباح منیجر صاحب نہایت برہم اور برافروختہ وارد ہوئے۔ کہاں ہے وہ مہمان؟ ہفتوں اور اٹھواڑوں بلکہ قمرالدین کے آنے تک پھر ہم اور منیجر صاحب اس غیبی مخلوق کو یہی کہہ کر تلاش کرتے رہے۔ وہ صاحب کہاں ہیں۔ وہ صاحب کون تھے۔ منیجر تو صرف انتقام کی غرض سے اور میں اپنی دیوانگی سے یہی بکتا رہا۔ آہ، ایک دفعہ دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے اور اب تک ۳۶ سال سے برابر چلّا رہا ہوں مگر توبہ وہ غیبی مخلوق کون تھی اور کیا تھی یہ خدا ہی کو علم ہے۔

ایک قطرۂ خون کی سرگذشت

میں پہلے پہل رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی ایک بوند تھا جسے کبھی کسی وقت ایک ثانیہ کے لئے بھی گردش نہیں چھوڑتی تھی۔ ایک دن میری بے قراریوں نے مجھے وہاں سے اِک اور مقام پر دفعتًا بدل دیا۔ یہاں مجھے گونہ قرار ملا۔ اِس قرار کا زمانہ جو واقعی میری تمام تبدیلیوں میں یادگار اور بہت ہی آرام کا وقت تھا مجھے خوب یاد ہے کہ پُورے ۲۷ دن تھے مگر میری گردش نے آخر مجھے یہاں بھی نہ ٹکنے دیا اور ایکا ایکی مجھے ایک کھلی ہُوئی دنیا میں بھیج دیا گیا۔ یہاں پہنچتے ہی بہت سی آوازوں، طرح طرح کی روشنیوں اور ہزارہا قسم کے حرکت کرتے ہوئے ذرّات مجھے گھیرے ہوئے تھے۔ یہ انقلاب! انقلابِ عظیم تھا۔

اور اب جو میں نے اپنے آپ پر غور کیا تو میں اسفل سے طبقۂ اعلیٰ کی طرف صعود کر رہا تھا اور مجھ میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا۔ میں کچھ اور ہی چیز تھا۔ اور اِس دھیمے مگر حیرت ناک انقلاب نے میری قد و قامت، طرز و ہیئت، وزن و جسامت غرض ہر چیز میں اِک خاص تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اور اب میں اس نقطۂ سُرخ سے ترقی کر کے نہایت ہی نازک شفاف رنگ و روپ لئے ہوئے گول گول ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک، مُنہ اور کان جسم و جان والا خوبصورت پیکرِ انسانی تھا۔ گویا نیچر بارش گورکھ دھندے کے جاری رکھنے والی قُدرت کاملہ نے مجھے اس انقلاب کے بعد اندھیرے سے نکال کر اُجالے میں لا کر کھڑا کیا۔ یہاں آ کر کچھ دن تو میرے سامنے کے رُخ لگے ہوئے شیشے دُھندلے دُھندلے رہے لیکن نہیں شدہ شدہ میرا دل یہاں بہلنے لگا۔ میری آنکھیں کھُل گئیں، اور ایک عجیب بہار

نظر آئی جس کو دیکھ کر نہ گردن جھکتی تھی نہ آنکھیں تھکتی تھیں
نہ جی بھرتا تھا۔ اور میں حیرت کا پُتلا بنا ہو کر رہ گیا
تھا۔ مگر اِس بے خودی کے ساتھ انقلاب کا، تبدُّل کا
قدیمی دور دورہ یہاں وہ حد سے زیادہ دیکھا کہ عقل
حیران رہ گئی، صبح۔ شام۔ دوپہر۔ پچھلے پہر۔ جاڑا۔ برسات
گرمی ہر وقت ہر گھڑی اور ہر پل یہاں کی ہر چیز کو تبدُّل
تھا۔ یہاں پر ہر چیز حرکت کرتی تھی اور پاؤں تلے کی
زمین ہر وقت نکلی جاتی تھی۔ دیر تک نظامِ عالم پر غور کرنے
سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ نیرنگیاں نہیں ہیں۔ بلکہ وقت
اِک تماشے والا ہے جس نے مجھے اپنے اسٹیج کے سامنے
کھڑا کر دیا ہے۔ وہ بار بار پردے گراتا ہے۔ مختلف
نظارے دکھائی دیتے ہیں۔ گوناگوں راگ بجتے ہیں۔
حیرت، غم، غصّہ۔ خوشی۔ مایوسی اور اُمید وضع وضع
کے اثرات پڑتے ہیں اور مختلف شعبدے دکھا دکھا
کر بے چین کرنے والی تصویریں پھر چھُپائی جاتی ہیں۔ میرے

پہلو میں. جو اک نازک پھول (دل) رات دن ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے جھُومتا رہتا ہے۔ اُس کو یہاں کی بہت سی چیزیں بھلی معلوم ہوئیں۔ آنکھوں سے نکلتی ہوئی روشنی (نظر) کو بڑا چین ملا۔ وہ اعلیٰ اور ارفع بغیر رنگ و احساس قامت و جسامت۔ شکل و وضع سے بڑی مگر وزنی مادہ (روح) خوش ہونے لگا اور میں کئی برس گزرتے ہی گیند بلاّ کھیلنے کے لئے اپنے ہم جولیوں کے ساتھ میدان میں نکل آیا۔

آہا۔ اب تو میرے تعلقات بھی ہو گئے۔ اک انسان مجھ کو بیٹا کہہ کر پیار کرنے لگا۔ دوسری اور ایک خُدا کی بنائی ہوئی محبّت کی پاک دیوی رحم کی مجسّم تصویر میری ماں ثابت ہوئی اور میرے ماں باپ کے ہم شکل و ہم وضع مجھ پر ہاتھوں ہاتھ چھاؤں کرنے کو تیار نظر آئے۔ میں خوشی خوشی بڑا ہوتا گیا اور یہ بتدریج بڑا ہونا یہ آہستگی لئے ہوئے تیز تیز

تبدیلی جو ہر انسان میں واقع ہو کر جاری رہتی ہے اور روزانہ اِک شے کو یکساں دیکھنے والی نگاہیں اُسے کبھی نہیں محسُوس کرتیں۔ برابر اپنے رنگ بدلتی رہی یہاں تک کہ اب مجھے عقل و ہوش آئے مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ میں انسان ہوں میرا کیا فرض ہے۔ میری جیسی ہزاروں جانیں پیدا کرنے والے نے مجھے بنایا ہے۔ ماں باپ میرے یہاں آنے کے باعث ہوئے ہیں اور وہی مجھ کو اولاد کے نام سے پال رہے ہیں۔ لیکن خدا جانے یہ کیا بات تھی کہ جس چیز کی طرف قدرتی طور پر میرا رجحان ہوتا تھا اُسی طرف سے مجھے روکا جاتا تھا۔ اور جن چیزوں میں مجھے مطلق اپنی طرف کھینچنے کا مادّہ نہ ہوتا تھا اُن پر جبراً توجہ کرنے کے لئے مجھے سخت ہدایت کی جاتی تھی۔ اِس کشش اور روک ٹوک سے میرا دم گھبرانے ہی کو تھا کہ عمر کی بیل بڑھ گئی دفعتاً میری آنکھوں میں اک نیا تُند و تیز اثر پیدا ہوا جس نے دیکھتے دیکھتے تمام جسم میں بجلی کی طرح سرایت

کی اور اِک نہایت ہی شور و شر انگیز کیفیت نے دل و دماغ سے لے کر اعضا اعضا پر اپنے پہرے بٹھا دئے۔ یہ شورا انگیزی بدمستیاں لئے ہوئے تھی اور میں گویا اِس نشے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر بالکل جھومنے لگا اِس نشے میں جھومنے سے اِک اور تبدیلی ہوئی یعنی وہی خون جس کا میں کبھی اِک قطرہ تھا اب دریا دریا ہوکر جوش مارنے لگا۔ وقت نے اِس میں تیزاب شامل کیا اور اِس کی حدّت کو اس درجہ بلند کیا کہ بخارات اُٹھنے لگے جو جذبات کی حدّت تھے اور میں اپنے سینے کی بھڑکتی ہوئی مشعل کی روشنی میں اب اپنے اِدھر اُدھر کسی اور ہم جنس کو ڈھونڈنے لگا اِس لئے کہ میں اس کو پیار کروں اور وہ مجھے میری محبت کا جواب دے۔ بے اختیار ہاتھ بڑھنے لگا۔ اور کسی کو آغوش میں کھینچنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ دل جگر میں طاقت۔ اعضا میں قوت جسم میں جان۔ مزاج میں ترقی حدّت گھڑی گھڑی ترقی کرنے

لگی اور آخر اِس گھبراہٹ اور آپا دھاپی میں کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آنکھوں پر کسی نے پردے ڈال دئے۔ کانوں میں سیسہ بھر دیا اور میں دنیا کے اندھے کنویں میں بالکل اندھا ہوکر جاگرا۔ شادی ہوئی۔ بیاہ ہوا۔ اور اولاد ہوگئی اور اولاد سے دُنیوی محبّت کے خزانے میں اک نیا مال بڑھا اور وہ مہرِ پدری تھی جس نے بال بچّوں کی بھولی بھالی صورت پیاری پیاری باتوں کا مشغلہ دے کر مجھے زندگی کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرنے کے قابل بنا دیا۔ مگر آخر یہ زمانہ بھی گذر گیا اور پھر اِک بارگی مٹّی کے کھلونے کے ٹوٹنے کے دن آگئے۔ ضعیفی آئی۔ ہاتھ پاؤں میں سے کسی نے اُنس نکال لیا۔ بال سفید ہوگئے۔ دانت ٹوٹ گئے۔ آنکھیں بے نور ہوئیں دم اُکھڑنے لگا اور زمانے کے زبردست تبدُّل نے مجھے اک دن بے حس و حرکت کرکے مٹّی کے اندھیرے گڑھے میں ڈال دیا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر گردش اور تبدیلی کا وہی زور شور تھا جو اوّل دن

سے میرے ساتھ لپٹی چلی آتی تھیں۔ میں قبر کے گڑھے
میں ڈال دیا گیا جلا دیا گیا یا بہا دیا گیا۔ ہر طرح سے آخر میں
مجھے خاک ہونا پڑا۔ خاک ہوتے ہی پھر زمانہ گذرنے لگا
انقلاب پیدا ہوئے تبدیلیوں پہ تبدیلیاں ہونے لگیں
اور میرے آس پاس کی مختلف اشیاء مجھ سے آن ملیں
میں نے اپنے ذرّات کی کشش سے ہر طرف ریشہ دوانی
پیدا کی چنانچہ آب و ہوا اور نیچر کی اِن صدہا وسائل سے
جو صرف اِسی کام کے لئے آسمان اور زمین کے
درمیانی حصّے میں ہر وقت متحرک اور سیّال رہتے
ہیں مجھے پوری مدد دی اور میں نے پھر اپنے اجزاء کو
کہیں لالہ و گل بنایا۔ کہیں سبزے کی لہک میں شامل
کیا۔ کہیں جنگلوں کے کانٹوں کو آب دی۔ بھیڑیوں اور
شیروں کے بھٹ آباد کیئے۔ آگ میں جا ملا۔ نباتات۔ جمادات
سے گذر کر حشرات الارض یعنی رینگنے والے کیڑے بن گیا
غرض میں کبھی سرد آب جُو کہلایا کبھی چنار کی آگ میں خود

جلنے لگا کبھی پروانا بنا کبھی شمع کی لَو گویا میرے ہی سینے سے نکلی کبھی خشکی، دریا، کبھی پہاڑ غرض ہر چیز پر میرا جزو شامل تھا۔ اور ہزار ہزار تبدیلیاں تھیں جو امتداد زمانہ کے ساتھ میری شکلیں بھی بدلتی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ خاک پہاڑ بن گئی۔ صحرا دریا ہوئے۔ دریا بگولے بن گئے اور اِن تمام طوفانوں کے ساتھ میرا انقلاب بھی بدستور جداگانہ صورتیں اختیار کرتا گیا لیکن اچانک پھر میرے کچھ ذرّے اِک دن کسی ذریعے سے کھاد میں جا ملے۔ کھاد کھیت میں پڑی۔ کھیت سے اناج، پھر کسی انسان نے کھایا اور میں پھر ایک دفعہ اُسی اناج سے خون بن کر اپنے پرانے دورے پھر نئے سرے سے طے کرنے لگا۔

ہمنشیں تجھ سے کہوں کیا دردِ غم
میں ہوں چکّر میں تو لغزش میں قدم
نقل سے بیٹھا بھی گھڑی بھر کو تو پھر
لے چلی مجھ کو بہا کر موجِ یم
چین دن کو ہے نہ راتوں کو قرار
میری بے چینی نہیں ہوتی ہے کم

ہر گھڑی صورت بدلتی ہے مری | ہر گھڑی قسمت میں میری پیچ و خم
مجھ سے جو پوچھے کوئی تو کون ہے؟ | اصلیت کا اپنی دے کچھ تو بھرم
صاف کہدوں کیوں چھپاؤں اپنا حال | شعر مولانا پڑھو یہ دم بدم

ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام
مثلِ سبزہ بارہا روئیدہ ام

باغِ بہشت

خدا کے کلامِ ربّانی میں باغ جنّت اور جنتیوں کے رہنے کی جگہ ان الفاظ میں اشارہ کی گئی ہے۔ اَنَّ لَہُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہَارُ۔

(منظوم ترجمہ) اُن کے لئے چمن ہیں فردوس کے لہکتے
بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں چھلک چھلک کے

جلّ جلالہٗ و جلّ شانہٗ یہ منظر گویا جیتے جاگتے میں نے گذشتہ ۵ر دسمبر سے ۹ر دسمبر ۱۹۲۰ء تک اپنی اِنھیں آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اور یہ باغِ بہشت میں نے جس سرزمین پر دیکھا وہ دہرہ دون تھا دہرہ دون۔

یہ چمن در چمن! یہ زمرّدیں صحرا ضلع سہارنپور سے کچھ فاصلے پر سطحِ زمین سے تقریباً چار ہزار فٹ بلند اسی ہندوستان

ہیں موجود ہے جس کی سب سے اونچی چوٹی کا نام مسوری ہے
اور جس کی تازہ تعریف و توصیف اُردو فارسی اور انگریزی
اخبارات میں مرزا محمود خاں طرزی صدر وفد دولت خداداد
افغانستان کے قلم سے اہل نظر کی نگاہوں سے گذر چکی ہے۔
دہرہ دون کی آب وہوا نہایت روح پرور اور بے حد لطیف
ہے زمین یہاں کی زر ریز و زرخیز۔ روئیدگی کا یہ عالم کہ چپہ
چپہ نخلستان۔ خیابان اور رنگا رنگ پھولوں سے لبریز
نظر آتا ہے۔ چیڑ۔ سرو۔ چنار اور دیودار کے صدہا بلکہ
ہزارہا بلند و بالا درخت دیوزاد کی فوجوں کی طرح صف بستہ
جا بجا کھڑے نظر آتے ہیں آبادی یا گرد و پیش اِس کا
ایشیائی اور یورپنائزڈ۔ دونوں مذاقوں کے بازاروں سے
آراستہ ہے۔ نہریں۔ آبشار۔ کوٹھیاں۔ مکانات۔ بنگلے
اِن سب میں مغربیت کے ساتھ ساتھ ایشیائی ترکیب
کی بھی ضرور جھلک دکھائی دیتی ہے۔
میں اپنے مستقر ریاست جھالاواڑ (راجپوتانہ)

سے چل کر ٹھیک ۵ر دسمبر کی شب کو ایک سیکنڈ کلاس میں
لیٹا لیٹا یہاں چلا آیا - پچھلی رات کی تو بیشک مجھے خبر نہیں
لیکن ہاں جب سے سُورج کی پہلی کرن اس گلستاں پر پڑی ہی
اس وقت میں یقیناً بیدار تھا رستے بھر میں اپنی ٹرین
کے دونوں طرف انواع و اقسام کی روئیدگی اِس کثرت
سے دیکھتا آیا کہ آخر عالم خیال میں میں کہیں سے کہیں جا نکلا
پھر جب وہاں سے پلٹا ہوں تو اچھی طرح دھوپ کِھنڈی
ہوئی تھی - اللہ اللہ! کس کس چیز کا ذکر کروں ؟ جا بجا
روح پرور چشمے جھلک رہے تھے - متعدد آبشار اپنے
اپنے نغموں سے گنگنا رہے تھے - سرسبز اور شاداب
درختوں سے دُلہن بنی ہوئی وادیاں وہ طلسمی نشیب و فراز
وہ گُل پوش چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں - وہ بنفشہ زار میدان
گویا مجھے دہرہ دون میں داخِل ہونے کی مبارکبادیاں دے
رہے تھے - پرند چہچہا رہے تھے - کوئلیں کُوک رہی تھیں -
طاؤس جھنگار رتے تھے - کبوتروں اور طوطوں کی ٹُکڑیاں

جا بجا لہراتی پھرتی تھیں۔ اتنے میں کئی چھوٹی چھوٹی سُرنگیں بھی آئیں مگر نہ اتنی متوحش اور تاریک جیسے شملے کے رستے میں سو سے کچھ زیادہ خوفناک ٹنل ریل کے رستے میں پڑتے ہیں۔ دُوسرے اس وقت روز روشن تھا۔ آخر اس تمام فاصلے کو آہستہ آہستہ طے کرتی۔ بار بار سیٹیاں بجاتی ہماری گاڑی خاص دہرہ دون کے پلیٹ فارم پر آ کر تھم گئی۔ میری سواری کے لئے یہاں آقائی نواب نصیر الملک مرزا شجاعت علی خاں بہادر عارف پرشین قونصل جنرل دولت ایران کی شاندار موٹر بہت دیر پہلے سے کھڑی تھی چنانچہ میرے اترتے ہی ان کے وردیاں پہنے ہوئے خدام دوڑے۔ میرا مختصر سامان موٹر میں رکھا گیا اور محلہ ڈالن والا کی طرف ہم روانہ ہو گئے۔

یہاں ایک نہایت پُر فضا کوٹھی میں میرے محسن نواب صاحب میرے منتظر تھے۔ جو آج کل بغرض تبدیلِ آب و ہوا کلکتہ سے یہاں آ کر مقیم تھے۔ آپ کے توسّط سے

ہیں یہاں کے عمائدین سے بھی ملا جن میں سے ایک ڈاکٹر محمد حسین صاحب برٹش قونصل جدّہ اور دوسرے سیادت پناہ سیّد ظلّ حسین صاحب آفیسر سروے پارٹی تھے۔ ڈاکٹر صاحب تو خیر فی نفسہ ایک نہایت ملنے جلنے والے خوش طبع اور کارآمد انسان تھے مگر سیّد ظل حسین صاحب اصل میں میرے عم محترم خان بہادر آغا اصغر علی خان قزلباش برٹش سفیر ایران کے دوست تھے جو ایسی بزرگانہ الطاف سے پیش آئے کہ میرے پاس لفظ نہیں جو اُن کا شکریہ ادا کرسکوں۔

غرض اِس مختصر سے چینج (تبدیلی) ہی نے مجھے فوراً جوان کردیا اور کیوں نہ جوان ہوتا۔ یہاں کی چند دن کی سیر و تفریح میں سچ مچ میں نے وہ کچھ دیکھا جو مہینوں میں کوئی نہ دیکھ سکتا۔

دہرہ دون اپنی گوناگوں خوبیوں اپنی متعدد خصوصیتوں کے اعتبار سے بڑا مرکز تفریح کہا جاتا ہے۔ یہاں بلند و بالا درختوں۔ قیمتی لکڑیوں کے عظیم الشان جنگلوں میدانوں

وادیوں نے ایک عجیب وغریب شکارگاہ کی صورت بھی اختیار کرلی ہے۔ برادرانِ ہنود کا وہ مشہور متبرک تیرتھ بھی یہیں ہے جسے ہردوار یا ہر کی پیڑی بھی کہتے ہیں

تارک الدنیا حضرات یا تزکیۂ نفس کے جویا ہنت رشی اور مُنی مہاتما اور سادھو لوگ صدہا کی تعداد میں یہیں کے پرفضا غاروں میں دنیا کے جنجال سے الگ ہوکر سانس لے رہے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں پھولوں سے لدی خاموش گپھائیں ہیں۔ جہاں عابد لوگ آسن مارے بیٹھے ہیں۔ بیشک بیشک اس احسن الخالقین کی لاانتہا طاقتوں اور لاثانی کرشموں اور صبیح وملیح قدرتوں کا صحیح اندازہ اسی بہشت ارضی میں ہو سکتا ہے۔ سچ مچ یہاں کا ایک ایک ورق دفترِ معرفت کردگار ہے۔ دیکھنے والا آئے اور دیکھے۔ گو یہاں میں موسم بہار کے آخر میں پہنچا تھا لیکن اس پر بھی ہر قطعہ۔ ہر کنج اور ہر وادی یہاں کی چمن زار تھی۔ چپے چپے پر نہریں بہہ رہی

تھیں اور صدہا چھوٹے بڑے محل ۔ بنگلے ۔ بلکہ جھونپڑیاں تک مختلف اور رنگا رنگ پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔

کیا بہار آئی ہے کثرت ہے حسیں پھولوں کی
آسماں پھولوں کا ہے اور زمیں پھولوں کی

جب دونوں وقت آپس میں ملتے ۔ صبح و شام جب آسمان پر بادل گھرتے یا جب گھُپ اندھیرے میں چھما چھم مینھ برستا ۔ یا جب مہرِ نیم روز اپنی خاص شان سے ایکا ایکی اس خیابان میں لَو دیتا ۔ تو بس اس قادرِ مطلق کی لاانتہا مصوریوں کی بے اختیار داد دینی پڑتی تھی ۔ میر انیس علی اللہ مقامہ نے کیا خوب فرمایا ہے اور شاید یہیں کے لئے فرمایا ہے ۔

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں
یا معدنِ کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر سو تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

ہموار میدان سرسبز پہاڑیاں ۔ گلریز وادیاں پایاب نہریں ندیاں ۔ چشمے ، آبشار جنگل بیابان غرض کل کائنات ایک جگہ دیکھ لے جس کا جی چاہے ۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین

دو عجیب ترین چیزیں

مجھے معاف کیا جائے اگر دو چیزوں کو میں عجیب ترین کہدوں یا ان کو میری عدم واقفیت پر محمول کر لیا جائے ۔ میں نے کشمیر جنت نظیر تو واقعی نہیں دیکھا مگر کوہستان کی پری یعنی دارجلنگ میں نے ضرور دیکھا ہے ۔ شملہ مسوری یہ سب میرے دیکھے ہوئے ہیں ۔ اتنے بلند و بالا بانسوں کا جنگل جو میں نے دہرہ دون میں دیکھا وہ اس سے پہلے کبھی اور کہیں میری نظر سے نہیں گذرا تھا ۔ یہاں بلا مبالغہ ایک ایک بانس کا پیڑ ایک قوی ہیکل سے قوی ہیکل اہرمن تھا جس کی ہر پوری واٹر ورکس کے ایک معمولی نل کے برابر تھی اور جس کی ہر گرہ میں

پانچ سات سیر چاول دم ہو سکتے تھے۔
دوسری چیز۔ اسے میرے شاعرانہ جمالیات میں سے سمجھیں۔ بیشک ایسا حیرت انگیز نظارہ اور ایسا دلکش ترنم کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ ایک ریتیلا مقام یا میدان جہاں سے کوئی دریا یا ندی نالا کبھی سیلاب کی شکل میں گزر چکا تھا مگر اس کے مٹے مٹائے نشانات اب بھی باقی تھے بس یہیں میں نے ایک وقت میں ایک مقام پر دو نہ دس نہ بیس تقریباً ہزارہا گلدموں کا جھلڑ ہوا پر اڑتا اور چہچہاتا دیکھا۔ یہ غول کا غول اپنے سُرخ اور کاہی لباس میں جہاں جاتا بس اتنا حصہ آسمان اور خلا کا اپنے ترنم اور سائے سے لبریز کر دیتا تھا۔ اللہ اللہ یہ نظارے مجھے آج تک یاد ہیں بلکہ ممکن ہے انھیں کبھی نہ بھولوں اس لئے میں دہرہ دون کو ہندوستان کا سوئٹزرلینڈ پنجاب کا اٹلی یا دانا کہوں گا۔ سچ ہے۔

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

حُسنِ اُردو کا حجاب

مدد! اے نقاشِ ازل تری رنگینیوں کے سائے میں آکر اک نہایت ہی کمزور ہاتھ حُسن اُردو کا حجاب اٹھانے کے لئے بڑھتا ہے لطف سے اس کی طرف دیکھ اور پیار سے اس کے دماغ میں وہ گراں مایہ نعمت کرامت کر دے جس سے اس کے قلم کی گلکاری دلوں پر نقش ہو جائے ہر پھول پتی تصویر ہو اور کلی کلی منہ سے بول اٹھے۔ چمن کا رنگ لفظوں کی بہار سے ٹپکے۔ شفق کی شوخی سرخیاں دکھائے۔ سطریں سبزہ بنیں۔ مضمون کی آمد بہتی نہریں اور قوت ایجاد وہ پھول برسائے کہ زمین سے آسمان تک پھول ہی پھول ہوں پھر جب عجب سے لرزتا کانپتا ہاتھ کسی کے چہرے سے نقاب اٹھائے تو حُسن اردو کی ہر قبولیتِ عام کا سہرا تُو خود باندھ دے۔ لو! وہ

نقاب اٹھی وہ اُجالا ہو گیا آ میری پیاری اردو آ! میں تیری دید کے مزے لوں گو عالم اجسام سے چلے ہوئے مجھے برسوں ہوئے اور عالم ارواح کی بھی خوب خوب سیر کی لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج بڑی مشکل سے تیرے دیدار نصیب ہوئے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ تیری سب سے پہلی جھلکی دیکھنے والا ایک دھنی موجد تھا جس نے اوّلیت کا ڈنکا بجا کر تجھے ایشیائی زبانوں میں شامل کر دیا اور صرف تیری ہی تولیت سے اپنے کو ولی کہلوایا پھر اک عرصے تک اس کے اکثر خوشہ چیں تیری چلمن کے پاس بیٹھے رہے تو نے اُن سے بھی نظر بازیاں کیں۔ لیکن اپنے اپنے خیال اپنی اپنی روش کے موافق کوئی تجھے کیسا سمجھا اور کس نے تجھے کیسا جانا۔ اِن بزرگواروں کا مختلف انداز کا سب سے بڑا سبب یہ بھی تھا کہ ان کے دماغوں میں فارس کے باغوں کی ہوائیں رکنی ندی کی طراوتیں۔ گلگشتِ مصلیٰ کی نُزہتیں اور تنگ شکر شیراز کی چاشنیاں بسی ہوئی تھیں۔ وہ جو کچھ دیکھتے تھے ولائتی عینکوں

سے دیکھتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے دوسروں کی زبان سے
ہاں کہیں کہیں اور کبھی کبھی تیرا ایک آدھ سیدھا سادھا بول
بھی اُن کے لب و لہجے سے نکل جاتا تھا جس پر انھیں ضرور فخر و
ناز ہوگا۔ پیاری اردو! پھر اک اور زمانہ آیا جس میں خدا کی
قدرت سے تیرے دو سچے مُشتاق یا صرف تری مدبھری
آنکھوں اور رسیلے الفاظ کے متوالے تیرا دربار ڈھونڈتے
ہوئے اسی ملک میں نکل آئے کہ تجھ سے ضرور ملیں گے ان کی
جان فشانی زمزمہ سنجیوں باریک بینیوں اور نکتہ طرازیوں نے
انھیں بے شک وہ جس دیا کہ آخر تو بھی ان سے مسکرا مسکرا
کر باتیں کرنے لگی۔ تیرے لفظ ان کی زبانوں پر تھے اور تری
آواز ان کے کانوں میں۔ ان قادر الکلاموں نے بے شک
گنگا جمنی ساغر چھلکائے۔ امرت کے دریا بہائے اور ایکا ایکی
آریہ ورت کا طوطی بولنے لگا۔ ان میں بھی دو روشیں تھیں
ایک سادگی پر صدقے دوسرا بناؤ پر قربان مگر حقیقت یہ ہے
کہ تیرے اکتسابِ نور سے یہ دونوں کلیم اپنے اپنے طُور کا جلوہ

الگ الگ قائم کر گئے۔ یہ بزرگوار خدائیگان سخن میر و سودا تھے انھوں نے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے رستے بنائے۔ میل لگائے کنویں اور چشمے جاری کئے اور اپنے منظوم کلام کو اکثر ضروریات کا ذخیرہ بنا کر ہنستے کھیلتے بہشت میں چلے گئے۔ ان کے بعد کچھ مدت تک تو انھیں کے جانشین انھیں کی بولی بولتے رہے انہی کے خوان نعمت کی ذلہ ربائی سے ملک کی دعوتیں کیں مگر کچھ دن بعد ایک اور دنیا آباد ہوئی یعنی خاص شاہجہان آباد کی خاک سے چار عنصر اعظم ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے پہلے آسمانوں پر اپنے بنائے ہوئے ستارے بھی جڑنے شروع کر دئے یہ ذوق و غالب و مومن اور میر انیس مغفور تھے۔ یہ چاروں بزرگوار گو بجائے خود جدا گانہ آفتاب و ماہتاب تھے لیکن ان میں سے دو اور دو میں سے ایک یعنی میر ببر علی صاحب انیس اعلیٰ اللہ مقامہٗ بقول اشہری بے شک فردوسی اردو ہوئے ان کے مسدس ہفت اقلیم پر بنات النعش بن کر چھائے فردِ کمال پر ان ہی کی مہریں ہوئیں اور دفترِ فصاحت

انھی کے نام کے طغروں سے مزین رہیں گے۔ ان سے پہلے اردو زبان کا کوئی ایسا عالم نہیں پیدا ہوا تھا جو انسانی جذبات واقعات اور معاملات کو ایسے عام فہم جامع اور موثر الفاظ میں ادا کر سکا ہو جیسا کہ حضرت میر صاحب مبرور نے اپنے کلام معجز نظام میں ظاہر فرمایا۔ اردو ہماری اردو۔ تجھ پر میر صاحب موصوف کا بہت بڑا احسان ہے ترے حسن کو میر صاحب کے قلم میر صاحب کے دل و دماغ نے یہاں تک افزائش دی کہ آج مرثیہ گوئی صنف شعر میں مشکل سے مشکل فن ہو گیا اور بڑے بڑے کاملان زمانہ بند تو بند ایک بیت کہتے ہوئے بغلیں جھانکتے ہیں ہاں آپ کے دور دورے سے ذرا پہلے ناسخ لاہوری اور آتش لکھنوی نے بھی اپنی اپنی زندگیاں اردو زبان کی بہاریں لوٹنے میں لگا دیں مگر نہیں نہیں پیاری اردو۔ تو انھیں نہیں آئی۔ آتش تو خیر پھر کچھ شرارے چمکا لیتے تھے۔ مگر ناسخ نے تو وہ نسخے ایجاد کیے کہ تمام لکھنؤ بیمار ہو گیا۔ اس پچھلے دور میں بے شک میری اردو تو نے اپنا دوسرا جلوہ بھی دکھایا وہ استاد الاساتذہ مرزا نوشاہ یا اسد اللہ خاں

غالبؔ مرحوم تھے آپ نے زمانۂ قدیم کی نظم کے پھلے پھولے درخت میں اک اور نیا پیوند لگایا اور ایسا اچھا خوشگوار پیوند لگایا جس نے نثر اردو کی صورت پیدا کی۔ میں کہاں سے ایسی زبان لاؤں جس سے مرزا صاحب کی نثر مرزا صاحب کا انداز بیان۔ مرزا صاحب کی لطافت مضامین اور مرزا صاحب کی قدرت وضع الفاظ کی تعریف کرسکوں بے شک بے ایسی اردوئے معلیٰ اگر کسی اردو کا نام ہے تو وہ انھیں اوراق میں ہے۔ جسے مرزا نوشہ اپنے چند خطوں میں بند کر گئے۔ پیاری اُردو تیرے نئے سرپرست تجھ میں چار چاند لگانے والے تیرے حسن کو روزافزوں ترقیوں پر لانے والے مرزا اسداللہ خاں غالبؔ ہی تھے آپ نے اس روش کو ایجاد کیا اور پھر طبّاع لوگ لے اُڑے۔ مرزا صاحب کے بعد ذوقؔ کی یادگاریں یا تبدّل الفاظ خاقانی ہند کے بقائے دوام کے دو نہایت ہی مستحکم سلسلے فصیح الملک بہادر نواب مرزا خاں صاحب داغؔ اور شمس العلماً مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزادؔ کے ناموں سے قائم ہوئے

ان سر آمدان روزگار نے بھی اپنے اسلاف کا اقتدار وہ نبھایا اور نظم و نثر یعنی اردو زبان کے دونوں جلوؤں کو کچھ اس طرح عالم آشکارا کر دیا کہ تمام ملک کی آنکھوں میں انھیں کی روشنی سما گئی بڑے بڑے ہٹ دھرم مان گئے۔ مزے لینے لگے۔ گردنیں ہل گئیں اور یہ گویا دو رائج الوقت سکے تھے جنھیں برابر کی دو گورنمنٹوں نے اپنے اپنے ممالک محروسہ میں ایکا ایکی جاری کر دیا۔ پرانے روپیے واپس ہو ہو کر خزانوں میں جانے لگے اور نئی ٹکسالوں میں نئے نئے لفظ ڈھل کر ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے لگے۔ داغ نے اگر کلیجوں میں چٹکیاں لے لی ہیں تو پروفیسر آزاد نے تمہید تسلسل اور آمد کی توپیں لگا لگا کر وہ گولے برسائے ہیں کہ دل تھرتھرا اٹھے اور آج تک کانوں میں وہی آوازہ ہے کہ گونج رہی ہے۔

اسی عالم میں علی گڑھ میں بھی ایک سرچشمہ جاری ہوا۔ جس کا کوہ شکن انجنیر سر سید احمد خاں جیسا مدبر اور قوم کا سچا جاں نثار تھا اس بزرگ نے بھی اپنی تصانیف سے اردو کو مالا مال کر دیا اور قوم کے لئے ایک مُہتم بالشان یادگار چھوڑ کر چین سے

جا سویا۔
سر سید مرحوم کے ہی ہم بزم مولانا حالی بھی پانی پت سے آئے۔ مولانا نے پہلے ایک تو قابل قدر لاجواب مسدس لکھ کر میری پیاری اردو تجھے رجھا لیا۔ قبولیت عام کے فتوے تک لے لئے بلکہ اخلاقی نظم یا مغربی تہذیب کے پھولوں کا ایک نیا گلدستہ پیش کر کے امید کی بہت سی کھیتیوں کو ہرا بھرا بھی کر دیا
بس اب صرف ایک ہی نام لینے کے قابل رہ گیا جو فی زمانہ اردو زبان کا سچا معاون ثابت ہو رہا ہے وہ نام نامی شمس العلماء ڈاکٹر حافظ نذیر احمد صاحب کا نام ہے۔ ان کی تصانیف بھی پیاری اُردو تیری سرمایۂ ناز ہے۔ انھوں نے بھی ترے لئے بہت باغ لگائے اور جب تک زندہ ہیں تیرا دامن ان کے دماغی پھولوں سے ضرور مہکتا رہے گا۔
رہا میں! تو میری پیاری اردو میری انتہائے مسرت اُردو! میں تو ایک رنگباز آدمی ہوں۔ آج قلم کی ندیاں بہ رہی ہیں کل خشک پڑی ہیں۔ آج برس رہا ہوں کل کھل گیا

اس لئے میرا کچھ اعتبار نہیں۔ لیکن اس وقت شگون کے لئے
دلِ پژمردہ کی جیب میں سے چند پِکسی ہوئی کلیاں نکال کر
کاغذ پر رکھ دیتا ہوں اور چلا جاتا ہوں۔

پھول والوں کی سیر

دھواں دھار بادل اُٹھے۔ اُودی اُودی گھٹائیں گھریں
نیلا آسمان کاک ریزی ہوا۔ بجلی کوندی۔ رعد گرجا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی
ہوائیں آئیں۔ اے لو! ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنی شروع ہو گئی۔ اور
آناً فاناً میں پیش نظر منظر کچھ کا کچھ ہو گیا۔ برکھا رُت! یہ بھی کیا
روح افزا رُت ہے جسے بھاشا والے برکھا۔ اردو داں، برسات
انگریز رینی سیزن۔ اور اہل فارس برشگال کہتے ہیں۔ اس میں شک
نہیں جتنا غیر معمولی اثر اس موسم کا ہندوستان پر پڑتا ہے اور جو
کیفیت یہاں والے اس موسم میں اٹھاتے ہیں وہ اور ملکوں میں
نصیب نہیں، یہاں سبزے لہک جاتے ہیں، مردہ زمین دوبارہ
زندہ ہوتی ہے، ہریالی متوالی بیلیں دوڑتی ہیں پھول برستے
ہیں ڈالیاں جھومتی ہیں۔ میدان۔ پہاڑ۔ جنگل۔ صحرا اور چمنستان

سب کے سب ایک خاص رُوپ پر آجاتے ہیں۔ ندی نالے بھرے پُرے بہتے ہیں۔ دریا جوبن پر آجاتے ہیں اور قریب قریب ہر نظر ہر منظر کی یقیناً بے مثال ہوتی ہے۔ انسان تو انسان اس رُت کی ہواؤں میں یہ خاصیت ہے کہ حیوان اور بہائم تک چونچال نظر آتے ہیں۔ مور جھنگارتے ہیں کوئل کوکتی ہے۔ پپیہا الاپتا ہے۔ بھونرے گونجتے ہیں رنگ برنگ کی تیتریاں پھول سونگھتی ہیں۔ مکھیاں بھن بھن کرتی ہیں اور جہاں تک نظر پڑتی ہے تمام چرند پرند ان دلآویزیوں سے مست اور سرشار ہوکر جھومنے اور کلیلیں کرنے لگتے ہیں۔ گائے بھینس جو سبزہ زار میں چرتی ہیں ان کے بھرے بھرے جسم، تیار بدن، نظر پھسل جانے والے اعضا، موتی جیسا پانی پڑتے ہی چمکنے دمکنے لگتے ہیں۔ وہ نرم نرم ہری ہری گھاس کھاتی ہیں اور گردنیں اٹھا اٹھا کر فضائے آسمانی کو دیکھتی جاتی ہیں۔ قدم قدم آگے بڑھتی ہیں اور گویا زبان حال سے ان تازگیوں کا ذکر کرتی جاتی ہیں جو قدرت نے ان کے لئے مہیا کر دی ہیں۔

برف جیسا سفید دودھ جھاگ جھاگ ان کے تھنوں میں

افراط کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ مکھن اور گھی کی نہریں ابلتی ہیں اور پیوسی اور دہی کے جمے ہوئے چشمے اپنے اپنے مالکوں کے لئے وقف کر دیتی ہیں غرض ایسے سمے میں دلّی پیاری دلّی سے سات آٹھ کوس نکل کر جب کبھی قطب چلے گئے ہیں۔ بس زندگی ہو گئی ہے زندگی۔ وہ صبح کا سہانا وقت صاف ستھرے میدان۔ نہائے ہوئے درخت۔ دھلی دھلائی سڑکیں اور میلوں ہرا بھرا سرسبز نظارہ آنکھوں کو سرور کر دیتا ہے۔ دل کو سرور ہوتا ہے اور طبیعتیں خود بخود چونچال ہو جاتی ہیں تالاب اور جوہڑ پانی سے لبریز ہوتے ہیں۔ لمبی لمبی گھاس ان کے گرد ہوتی ہے۔ لال سبز کائی ان پر اپنا جماؤ دکھاتی ہے۔ کالی کالی گھٹائیں ان پر اپنا سایہ کرتی ہیں۔ اور سفید سفید عمارتوں کا جگہ جگہ سبز درختوں میں سے جھانکنا بس کچھ انھیں سے پوچھئے جنھوں نے دیکھا ہے۔ اے لیجئے وہ سفید بگلوں کی قطار کالے کالے بادلوں میں روئی کے گالوں کی طرح اڑتی ہوئی منصور کے مقبرے سے چلی بیوی نورۃ پہنچی۔ جوگ مایا میں براجی اور رواں رواں عین قطب کے جھرنوں پر

پر مارنے لگی۔ آج ہی تو سُنا ہے یہاں پنکھا بھی ہے۔ پھول والوں کا پنکھا اور وہ بھی جمعرات کا۔ بھئی واہ۔ پھر تو اس کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ شاموں شام لاٹھ سے لے کر جھرنے تک بلکہ اس سے بھی پرے ہندو مسلمان۔ غریب امیر۔ وضیع و شریف۔ بوڑھے جوان لڑکے بالے۔ غرض ایک خلق خدا ٹوٹ پڑے گی اور سبھی کے سبھی اپلے گیلے پھرتے نظر آئیں گے۔ پھر قطب صاحب کا لمبا لہکارا بازار ہو گا۔ جو رنگین چھبیلے شوقین مزاج تماشائیوں سے اٹا ٹٹ بھر جائے گا۔ دورویہ دوکانیں سجی ہوئی۔ شیشہ آلات جھمک رہے ہیں قسم کی مٹھائیاں چنی ہوئی ہیں۔ کھانے پک رہے ہیں اور ان کی بوباس دماغوں کو تازہ کر رہی ہے۔ کہیں میوے قرینے سے لگے ہوئے ہیں۔ کہیں دلّی کے سادہ کار زر و زیور سے چاندی سونے کا دریا بہا رہے ہیں۔ کہیں سلمے ستارے کی جوت آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرے گی اور دستکاری کے گوناگوں سامان، نئی اور پرانی چیزیں وضع وضع کے مصنوعات نظر آتے ہوں گے۔ اس وقت دیکھیے سیر تماشے کے متوالے نئی نئی

پوشاکیں پہنے جھومتے جھامتے چلے آتے ہیں۔ جس میں صوفی صافی بھی پھریریاں لے کر مسکرا رہے ہیں۔ کٹورہ بج رہا ہے۔ سودے سلف والوں کی پکار تمام نظارے کو گرم کئے دیتی ہے۔ شوقین نوجوان بنے سنورے۔ جوئی کے آڑے گنٹھے گلے میں ڈالے عطروں سے بسے۔ گلوریاں منہ میں دبائے ادھر سے ادھر بل مارتے گشت لگا رہے ہیں۔

ایکا ایکی ابیلے سروں میں شہنائی کی آوازیں آنے لگیں جن کا تسلسل بڑھا۔ اور نفیری والوں کا دستہ گاتا بجاتا سامنے آگیا انہی کے آگے آگے پھول والوں کا پنکھا، لدا پھندا۔ ہوا کو ڈھکاتا جوبن میں تلتا سامنے سے گزرا۔ بس اب کیا تھا۔ رستے چلتے مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔ بالاخانوں پر لوگ آ بیٹھے۔ جگہ جگہ سے بیلیں اور دوپٹے انعام واکرام ہونے لگے۔ رنگین رنگین آنچل ہوا میں لہرائے۔ نگاہیں ایک ہی گلدستے کی طرف جم گئیں۔ اور نفیری کے دل کش نغموں نے گردنیں ہلا ہلا دیں، یہ میلہ شاہی میلہ کہا جاتا ہے۔ خیر وہ زمانہ اور اس کا شباب تو ہمیں کہاں نصیب لیکن پھر بھی جیسا آج کل ہوتا ہے

اور ہم نے دیکھا ہے۔ وہ بھی دور دور ملکوں ملکوں میں نہیں ملے گا۔ بلکہ بِلا خوفِ تردید کہتا ہوں کہ ایسا نفیس اور اجلا میلہ میں نے تو ہندوستان بھر میں کہیں نہیں دیکھا۔ بلکہ دنیا کے پردے پر نہ ہو تو کیا تعجب ہے۔ ہاں البتہ انسانوں کے مذاق مختلف ہیں۔ بات یہ ہے کہ ایسا موسم ایسے سامان اور ایسے لوگوں کا صرف ایک سرزمین پر بیک وقت جمع ہو جانا ہی نہایت مشکل بات ہے۔

اے لیجئے وہ پنکھا آگے بڑھا۔ وہ خلقت ٹوٹی اور اس کے پیچھے چلی۔ وہ پھوار پڑنے لگی۔ وہ نم آلود ہوائیں چلیں۔ شہنائی کے نغموں نے سونے میں سہاگے کا عالم دکھایا۔ اور بے اختیار دلوں کی کلیاں کھل گئیں۔ اب جگہ جگہ یہ پنکھا اسی طرح ٹھہرتا جائے گا۔ دکانوں اور بالاخانوں پر سے یہ چار دن کے نئے نواب نفیری والوں کو گوٹے لگے سادے۔ رنگ برنگ کے دوپٹے انعام دیں گے۔ روپے اور ریزگاری پھینکی جائے گی۔ اور انہی چہچہوں اور قہقہوں میں شام ہو جائے گی۔ رات ہوگی۔ ہاں خوب یاد آیا اس سے بہت پہلے جہاں جھرنا جھرتا ہے وہیں جہاں ایک بہت بڑی باولی ہے وہاں

گدائیاں ہوتی ہیں۔ نامی گرامی پیراک پیرتے ہیں۔ غوطے لگاتے ایک دوسرے کا دم دیکھا جاتا ہے۔ کُشتیاں ہوتی ہیں۔ آپس میں چھینٹیں لڑتے ہیں۔ چُہلیں، مذاق اور ضلع اور جگت ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے تناور درختوں میں جھولے پڑتے ہیں پینگیں بڑھائی جاتی ہیں۔ ریشم کی ڈوریاں اور لال سبز پٹڑیاں جگمگاتی ہیں۔ ترانے اڑتے ہیں۔ اور ملار گائے جاتے ہیں۔

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے
(فصیح الملک داغ دہلوی)

چھُوئی مُوئی

اے سبز پوش! نازک نازک چھدری۔ کچھُوئی پتوں کی مالک نرم نرم ننھی منی شکل کے نازک لہر بوٹے تو مجھے دل سے بھاتا ہے، کیوں؟

اس لئے کہ تو عالمِ نباتات میں ایک لاج دُولارا پودا ہے میں جب کبھی تیری اس قدرتی شرم اس معصومانہ حیا اور کوار پنے جیسی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اُس صانعِ مطلق کے اس کمال پر بے اختیار لاکھ لاکھ تحسین کرنی پڑتی ہے۔ اے مجسم شرم! اے سراپا حیا! تو ضرور کوئی عورت ہے۔ عورت بھی کواری بالی جو یقیناً کسی نیک کوک اور پاک وپاکیزہ تخم سے برومند ہوئی ہے۔ واقعی شریف عورت کا حقیقی زیور حیا ہے ورنہ جس آنکھ سے پانی ڈھلا وہ کبھی نردئی نہیں رہتی۔ اس میں معصومانہ ادائیں کبھی نہیں جھلکتیں سچ مچ حیا اور شرم

تجھ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے جس کا ہر دیکھنے والے پر اثر پڑتا ہے بشرطیکہ اس کی آنکھیں ہوں - سُن سُن! تو کہیں لجونتی کی چھوٹی بہن تو نہیں ؟ جو سایہ پڑتے ہی کمھلا جاتی ہے -

مگر تو نامحرم کا ہاتھ لگتے ہی بدن چُرا دامن سمیٹ اٹھ جاتی ہے - چُرمُر ہو جاتی ہے بلکہ جہاں کسی نے تجھے چُھوا اور تجھ پر غیرت چھا گئی - تو پسینے پسینے ہو گئی اور منھ بنا گردن جُھکا جھٹ ایک طرف کو ہو بیٹھی - اے چوتھی کی دلہن! اگر تو دلہن ہے تو خدا تیرا سُہاگ بنائے رکھے -

واقعی ترا یہ بگڑنا - ترہ بھر ہونا ترے غیورپن پر دال ہے ٹوٹ جائیں وہ ہاتھ جو ترے ستانے کو تیری طرف بڑھتے ہیں - ترے قد کے برابر بجلی گرے اُن انگلیوں پر جو گستاخانہ تیری طرف حرکت کرتی ہیں حقیقت میں تو بڑی شریف نیک ذات پاک دامن لجونتی دیوی ہے جو نہیں چاہتی کہ کسی غیرِ جنس کا نجس ہاتھ تجھ سے مَس ہو - میں خوب جانتا ہوں کہ تو اتنی نازک دماغ ہے کہ نسیمِ سحری کے جھونکے سے

بھی ترا ایک رنگ آتا ہے اور ایک جاتا ہے۔ تو اُن نازک پھولوں کو بھی گود میں لینے کی متحمل نہیں جو ہوا کی سرسراہٹ سے بالکل اضطراری حالت میں تجھ پر جا پڑتے ہیں اور تری حیا اور شرم کو دیکھ کر پھر اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔

وفائے عہد

وفائے عہد صرف اپنی ذات کے لئے اس کی مثالیں تو اقوام
عالم میں جا بجا مشہور رہیں مگر دوسرے کے لئے عہد کا وفا کرنا اس
خاص صفت میں ہندوستان کی خاک سے جیسی جیسی شاندار
ہستیاں ہو گزری ہیں ان کا مثل و نظیر پیدا کرنا ہر خاک کا حصہ نہیں
سری مہاراج راجہ رام چندرجی کا قصہ تو ہندوستان کے
ہر فرد و بشر کو معلوم ہی ہے مگر ان کے لئے یہ کہہ دینا کچھ مساوات سی
پیدا کر دیتا ہے کہ ہندوؤں کے اعتقاد کے موافق وہ بھگوان کا ایک
خاص اوتار تھے۔ اگر وہ اپنے پتا کے قول کو اس طرح نبھا گئے تو
اچھا ہی کیا؟ البتہ معمولی انسان کوئی اس طرح اپنے دھرم کو پالے
تو وہ بے شک قابلِ ستائش کہا جا سکتا ہے چنانچہ ایک معمولی
انسان کی حیثیت سے اس خاص صفت میں بھی ہم بھیشم پتامہ کا کیرکٹر

اس وقت پیش کرتے ہیں۔

دیکھنا تو یہ ہے کہ گزشتگان کے ان کارہائے نمایاں سے آئندہ نسلوں کو کس قدر سبق ملتا ہے۔ اگر ان صفات کو ہر انسان اپنا موٹو بنانے کی کوشش کرے تو وہ بھی کس قدر عظیم الشان ہستی کا مالک بن جائے۔

بھشیم پتامہ مشہور مہا بھارت سنگرام (جنگ عظیم) پانڈو اور کوروں کا ایک لاثانی کیرکٹر تھے جن کا جتی ستی ہونا باپ کے عیش پر اپنی جوان جان بلکہ زندگی تک کو خاک میں ملا دینا اور مرتے مرتے اپنے عہد پر قائم رہنا ایک حیرت انگیز قربانی ہے جو ہندوستان کے مردانِ کار کی فہرست کو روزِ روشن کی طرح جگمگا دیتی ہے۔

یہ بہادر سُور بیر ایک جلیل القدر راجہ کا چشم و چراغ نوبیٹوں میں ایک وارثِ سلطنت تھا جس نے باپ کی خاطر عمر بھر جتی رہنا گوارا گیا۔ شادی سے انکار کر دیا۔ اور باوجود ہر طرح کی قدرت رکھنے کے اپنے عہد کو مردانہ وار وفا کیا۔ اور آخر اپنی ہی بتائی ہوئی تجویز سے دشمن کے تیروں سے اُسی آہنی چتا پر جان بھی

دے دی۔

اس بہادر زور آزما اور لاثانی سپہ سالار کی زندگی شروع سے آخر تک پڑھنے اور سننے کے لایق ہے۔ کاش! ہندوستان کے نئے سپوت ان کارناموں سے سبق حاصل کریں۔ اپنے عہد کو بھی اسی طرح استوار رکھیں اور ان کی زندگیاں بھی آنے والی نسلوں کے لئے ذخیرۂ تہوّر وجرأت بن کر مشہور ہوں۔

کہتے ہیں بھیشم پتامہ کی ماں رانی گنگا کا اپنے شوہر سے یہ اقرار تھا کہ میں اپنی اولاد کی خود مالک ہوں۔ اگر تم نے ان کے معاملے میں کبھی درک دیا تو تم کو اسی دن چھوڑ کر تمھارے رنواس چلی جاؤنگی اور پھر مدت العمر میرا تمھارا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ آخر اسی قرارداد کے موافق آٹھ بیٹے رانی سے پیدا ہوئے اور راجہ نے صبر کی سل چھاتی پر رکھ کر وہ آٹھوں بیٹے رانی کے حوالے کر دیئے جنھیں اس نے باری باری مقفل کر کے دریا میں بہا دیا۔ اور پھر ان کا کوئی پتہ نہ لگا۔ مگر نویں دفعہ جب بھیشم پیدا ہوئے اس وقت راجہ آتش فراق فرزندان سے کباب ہو گیا اور اس نے ڈرتے

ڈرتے رانی سے یہ التجا کی کہ نواں بیٹا تو مجھے دے دیا جائے۔ راج کا کوئی تو مالک آخر اس دنیا میں برقرار رہے جس سے میرا نام اور سلطنت کا سہارا قائم رہے۔

غضب ناک رانی اسی وقت آشفتہ ہوگئی۔ اور اسی غیظ و غضب میں بھیشم پتامہ کو راجہ کی گود میں دے کر جلاوطنی اختیار کر لی اور جاتے جاتے یہ کہہ گئی "بس یہیں تک میرا تمھارا ساتھ تھا۔ ہاں اتنا اور سن لو میرے بعد اگر تمھیں شادی کا چاؤ اُچھلے تو یہ لو میرا کنگن۔ جس کنواری کنیا کے ہاتھ میں یہ کنگن ٹھیک آئے صرف اُسی سے تمھیں شادی کرنے کی اجازت ہے"۔ راجہ نے ایسا ہی کیا۔ اور جب رانی کے جانے کے بعد اسے دوسری شادی کی ضرورت پڑی تو اس نے وہی کنگن ملک میں جا بجا اپنے اہلکاروں کے ہاتھوں بھیج کر اپنے لئے نئی رانی کی تلاش جاری کی۔ راجہ کے سفیر مہینوں اور مدتوں دور دور پھرتے رہے مگر کہیں کوئی گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا آخر مایوس ہو کر جبکہ وہ ایک ساحل کے کنارے بے نیل و مرام ڈیرہ کئے پڑے تھے یکایک ایک ملاح کی لڑکی چندے آفتاب چندے ماہتاب سرو رواں کی طرح ان کے

سامنے آگئی اور ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ یہ مثل بالکل وہیں ٹھیک اُتر ہی۔ گنگا رانی کا کنگن اس کی کلائی میں بجنسہٖ اس طرح آگیا جس طرح اسی کے ہاتھ کے لئے بنوایا گیا ہو۔ اس فرحت افزا واقعہ کی خبر چند ہی روز میں راجہ تک پہنچی اور وہ دیدہ لب ریز اپنی نئی دلہن کا مشتاق آندھی اور مینھ کی طرح مع اراکین خدم وحشم اس غریب ملاح کی جھونپڑی میں جا براجا۔ اس وقت اس ٹکڑی میں راجہ کے ساتھ اس کا بہادر راج کنور شیر دل بھیشم پتامہ بھی تھا۔

حُسنِ مجسم لڑکی کے باپ نے پہلے پہل تو بہتیری اُکھیڑ پچھاڑ کی "کجا راجہ کجا پرجا۔ ہم غریبوں کی بیٹی راجاؤں کے ادب قاعدے کیا جانے" سبھی کچھ کہا مگر جب راجہ کی خواہش کا تقاضہ دیوانگی تک پہنچ گیا اس وقت وہ بھی بکھر بیٹھا۔ اور شرطیں اتنی ٹیڑھی اور لالچ سے بھری پیش کیں جنھوں نے راجہ تو راجہ تمام حاضرین کے بھی چھکّے چھڑا دئے۔

ہر چند اراکین نے سمجھایا کہ بھائی آدمی کو اپنی چادر دیکھ کے پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ یہ مانا کہ تم اس وقت راجہ کو اپنے پلے پر

سمجھتے ہو۔ اسے اپنے متاعِ زندگی کا خواہش مند جانتے ہو لیکن پھر بھی اتنا تو تمہیں ضرور خیال کرنا چاہیئے کہ تم راجہ کی رعایا ہو تمہارا دھن دولت جان و مال سب اسی کا ہے۔ اس وقت اگر چاہے تو تم سے جبراً ہر شے کا مطالبہ کر لے۔ اور تم کو چار و ناچار دینا پڑے۔ مگر وہ تو خود بھی تمہارے دروازے پر آیا ہے اور تم سے عدل و عاجزی کے لہجے میں سوال کرتا ہے۔ تمہارا فخر ہے کہ تم اپنی بیٹی اس کے چرنوں میں حاضر کر دو اور اپنی حیثیت کے موافق جس قدر جاگیر چاہو حاصل کر لو۔ مگر مضبوط خیال ملاح کس کی سنتا تھا۔ وہ برابر اپنی ہٹ پر قائم رہا اور آخر اس نے اپنی دو شرطیں پیش کر ہی دیں۔ جن کے بغیر شادی سے قطعی انکار تھا۔

(۱) راجہ کا راجکمار موجود ہے اس کی موجودگی میں انصاف چاہتا ہوں۔ ہم لوگ غریب آدمی ہیں اگر کسی غریب سے رشتہ کیا جاتا تو جو کچھ پلنگ پیڑا جمع جکڑی۔ مکان ناؤ شکارا اُس ملاح کی ملکیت میں ہوتا۔ وہ سب میری بیٹی کا حق ہوتا۔ اس لئے راجہ کی راجدھانی اور اُس کی موجودہ سلطنت پر میری بیٹی کا قبضہ ہو گا اور

اگر میری بیٹی سے راجہ کے ہاں کوئی اولادِ نرینہ پیدا ہو جائے تو راجہ کے بعد راج تلک اس کے لڑکے کا حق ہوگا اور موجودہ کنور صاحب معزول سمجھے جائیں گے اور راج گدی پر بھی آئندہ میری ہی لڑکی کی اولاد راج کرے گی۔ یہ سننا تھا کہ راجہ نے نہایت ندامت سے گردن جھکا لی۔ مشیروں کے غصے کی کوئی حد نہ رہی مگر بھیشم پتامہ مجبور اور بے بس باپ کی ان مشکلات کا اندازہ کرتے ہی فوراً آگے بڑھے اور ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ "خداوندِ نعمت آپ کے فکر کی وجہ؟ پیارے پتا جی! یہ سوال تو مجھ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں ملول اور دل گرفتہ ہونے کی کیا بات ہے"۔ اس ملاح کا مُطالبہ نہایت صحیح ہے اور میں حضور کی طرف سے اس مطالبے کو بخوشی منظور کرتا ہوں ہاں ہاں بے شک اگر کوئی اولاد ہو گی تو وہی لڑکا اس گدی کا مالک ہوگا اور میں عہد کرتا ہوں کہ میں اس کی غاشیہ برداری کروں گا اور جب تک زندہ رہوں گا اس میں ذرہ برابر کبھی فرق نہ ہوگا۔ حضور اُن کی پہلی شرط منظور فرمائیں۔

ملاح! دھن ہے مہاراج کنور آپ کو دھن ہے!۔ اب

دوسری شرط میری یہ ہے۔ کہ فرض کیجئے کہ آپ نے عہد کر لیا اور آپ اپنے عہد پر قائم بھی رہے مگر آپ کی اولاد تو اس کو کسی طرح بھی نہیں مانے گی۔ میری بیٹی کے حقوق کی پامالی کا خطرہ تو جب بھی باقی رہا۔ آپ نہ سہی آپ کی اولاد سہی۔ وہ اس تخت پر قابض ہو جائے گی اس وقت بھلا میں غریب کیا کر سکتا ہوں۔

بہت سی آوازیں۔ خاموش خاموش! اُو حریص انسان خاموش!۔

بھیشم!۔ نہیں نہیں! وہ ٹھیک کہتا ہے۔ میں دوسرا عہد کرتا ہوں کہ میں بھیشم پتامہ اپنے پتا جی کی خاطر مدت العمر شادی نہیں کروں گا بلکہ عورت کی صورت اپنی خواہش کے واسطے کبھی نہیں دیکھوں گا۔ اور راج گدّی پر انھیں ماتا جی کی اولاد ہمیشہ ہمیشہ راج کرے گی۔

یہ ہیں ہم سے پہلوں کے کارنامے۔ کیا اس دنیا میں ہے اب کوئی ایسا سپوت؟ اب تو وہ سورما پیدا ہوتے ہیں کہ خاص باپ کے حرم کو اپنا جلیس خاص بنا بنا کر حق پدری ادا کرتے ہیں۔

کھلتا ہوا پتہ

اس کی صناعیاں - اس کی دستکاری - اس کی رنگیلی طبیعت اور ایک دوسرے سے صورت نہ ملنے دینے والی قدرتِ کاملہ بھی کس شان کی موجد ہے کہ ہر خاک میں ایک جوہر، ہر جوہر سے ایک تصویر اور تصویر میں وہ وہ باتیں پیدا کر دیتی ہے جو دیکھ کر عش عش کرنے کے سوا ذرہ برابر بھی نقل نہیں کی جا سکتی۔

ہوا و سبزہ و گلہائے رنگیں
یہ ساری شوخیاں ہیں اک حسیں کی

اس بھری پُری دنیا میں کیا کوئی ایسا چابک دست مصور سائنٹسٹ - بوٹنیکل آرٹس کا ماہر باغبان یا مالی موجود ہے جو ایک جوئی کے نازک پھول کی نظیر اپنی قدرتِ مُدرکہ یا کاریگری سے بنا سکے؟ اِک سادے سے پتے پر ویسے ہی نرم و نازک نقش

کسی مشین یا دوا کے زور سے پیدا ہو جائیں گے جو ایک معمولی کیلے کے چوڑے پتّے پر دیکھے جاتے ہیں۔ ہاں ہاں امریکہ کا مشہور حکیم ایڈیسن جو اپنے قول کے موافق ایک بٹن کے دبانے سے گریٹ برٹن کو اُڑا دینے کی دھمکی دیتا ہے۔ بلکہ اس کے بتائے ہوئے عجائبات اس وقت سیّاحوں کے لئے اعجاز اور سحر عالم آشکارا کا مرتبہ دکھا رہے ہیں کیا اس سے یہ ممکن ہے کہ وہ ایک چھوٹی سی ہری ہٹنی کو توڑ کر اس کی جگہ ویسی ہی دوسری لگا دے۔ ایک دن میں نہیں سو دن میں نہیں ہزار دن میں۔ نہیں یہ ناممکن ہی۔ قدرت کے مقابلے میں کس کی مجال ہو سکتی ہی جو ایک تنکا بھی بنا سکے۔ قدرت کی صنعتیں زبردست حکمتیں ہیں اور حکمت کی شان ہر ذرّے ذرّے پتّی پتّی اور روئیں روئیں سے ظاہر ہی اگر دیکھنے والے کو سلیقہ ہی اگر سمجھنے والے کو سمجھ ہے تو وہ دن رات میں کیا کچھ نہیں دیکھتا۔ اور ذرا سے غور میں کیا کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ وقت پر لگا کر اڑ رہا ہے۔ زندگی موت کے دن گن رہی ہے۔ خواہشیں جان لئے لیتی ہیں۔ اور آنکھیں کھلے رہنے

پر بھی بند ہیں۔
کھلتا ہوا پتا آیئے میں بتاؤں ؟ اس سُرخی میں کیا بھید ہے اور نفسِ مضمون کو اس سے کیا دست و گریبانی ہے۔ میرے گھر میں ایک ایسے درخت کا گملہ ہے جس میں پھول پھل تو نہیں آتا مگر ہاں اس کے پان کے سے پتے۔ لال لال اور بڑے بڑے ہو کر بہت ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک چھوٹا سا پودا ہی اس لئے اس کی بساط کے موافق ہر شاخ میں دو دو تین تین ہی پتّے آیا کرتے ہیں۔ مگر وہ بھی باری باری سے۔ یعنی جب ایک پتہ پورے طور پر اپنی بہار دکھاتا ہے تو جل کر گر پڑتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا پیدا ہو جاتا ہے اس کے کھلنے کا بھی عالم نرالا ہی ہوتا ہے۔ لال لال ڈنٹھل میں سے پہلے اک مہین سی ملگجی نوک پیدا ہوتی ہی جو بڑھتے بڑھتے نکھرتے نکھرتے کوئی پانچ چھ دن میں ایک سبز پتّی سی بن جاتی ہی۔ اور یہی درحقیقت وہ لپٹا ہوا پتا ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہوتا ہے۔
رفتہ رفتہ جتنی جتنی نسیم سحر کے پولے پولے ہاتھوں کی ہلکی ہلکی

جنبش اور دریا دل شبنم کے گول گول موتیوں کی نچھاور اس پر ہوتی جاتی ہے۔ سورج کی دھیمی دھیمی شعاعیں اِدھر اُدھر سے پڑتی جاتی ہیں۔ اتنی ہی اتنی یہ پھول سی پتی لمبی ہو ہو کر کھلتی بھی جاتی ہے اور آخر ایک اٹھواڑے کے بعد وہی رازِ سر بستہ ایک پنجۂ رنگارین ہو جاتا ہے۔ جب یہ کھلنا شروع ہوتا ہے تو اس کی نیم وا حالت اُن نازک انگلیوں کی جھلک مارتی ہے جو حنا کی بدولت خون میں ڈوبے ہوئے نشتر کہلاتی ہیں۔ اس کی سُرخ سُرخ رگیں جب آپس میں پھیل پھیل کر مل جاتی ہیں تو یہ عین اُس نازنین مظلومہ کا کمزور ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ جس نے قاتل کی ننگی تلوار روکنے کے لئے گھبراہٹ میں اپنی گوری گوری ہتھیلی آگے کر دی ہو اور وہ لہو لہان ہو کر رہ گئی ہو۔

جب تک یہ کھلتا نہیں ہے اور ایک سر بند کلی کی طرح رہتا ہے اس وقت تک میں کیا بتاؤں کہ دن بھر میں کے کے دفعہ میری نگاہیں اس تک جاتی ہیں اور مایوس پلٹ آتی ہیں۔ یہ کھلنا شروع ہوتا ہے اور میری بے قراری پہلے سے بھی دو چند و سہ چند ترقی کر جاتی ہے

یہاں تک کہ وہ بالکل کھل جاتا ہے اور میری تشنہ لب نظریں اس کی رنگینیوں سے لبریز ہو کر بالکل سیر ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ اپنی عمر کی پوری میعاد تک برابر کھلا رہتا ہے مگر خدا جانے کیا بات ہے کہ پھر مجھے اس کی طرف سے کچھ ایسی مساوات ہو جاتی ہے کہ کبھی بھولے سے بھی نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھتا۔ ہاں جب کبھی دھیان پڑھتا ہے تو کدھر؟ دوسری بنّی کی طرف اس امید میں کہ دیکھئے وہ کب کھلتی ہے۔ اس میں بھی اک عجیب بھید ہے۔ اس میں اک طرفہ جدّت ہے بلکہ اس میں اچھّی خاصی نصیحت پوشیدہ ہے جیسے کھلے ہوئے پتے کے خطوں نے ذرا سے غور کے بعد حرف بحرف کہہ دیا۔ کمال اور نقش میں کچھ یونہیں سا فرق ہے۔ کمال کے بعد ہی زوال شروع ہو جاتا ہے۔ جس کی دھیمی دھیمی نمائش بہت کم دکھائی دیتی ہے صرف مٹھی کھلنے کی دیر ہے۔ خدا نہ کرے جو کسی کی مٹھّی کھلے۔ کلی کلی کی رسیا نگاہیں ساری خوشبو بن کر اڑ جاتی ہیں اور پھر ادھر بھولے سے بھی نہیں بھٹکتیں۔ راز سربستہ جب تک سربستہ ہے بالکل محفوظ اور مقید ہے۔ جہاں ذرا اس کی

بُو پھوٹی اور بس۔ ہونٹوں نکلی اور کوٹھوں چڑھی۔ اپنا راز جان سے زیادہ عزیز چیز ہے۔ اپنی مٹھی کھول دینی سراسر نادانی ہے۔ دوسرے سے اپنا بھید کہہ دینا اس کا غلام بن جانا ہے۔ بھلا یہ کون سی دانائی ہے کہ اپنی تمام قوتیں اپنا جوش اپنی عزّت اپنی آبرو دفعتاً دوسرے کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں۔ دنیا والو! بھرم بھی عجیب چیز ہے۔ اور بے اعتباری سخت ذلّت۔ اپنا بھرم رکھنا گویا دوسروں سے اپنی عزّت کرانی ہے۔ اس لئے اپنے خزانے کی کنجی دوسرے کی جیب میں ڈال دینی دیدہ و دانستہ اس کا محتاج بننا ہے۔ مٹھی کھلنے کے بعد کبھی بند نہیں ہو سکتی اور گئی ہوئی خوشی پھر نہیں پلٹتی۔ اپنا راز جب تک اپنے دل میں ہے اُسے ذرا آنچ نہیں اور جہاں دوسرے کو ہم راز بنایا ہمیشہ نگاہیں نیچی ہوئی دیکھیں۔ اے اس نئی روشنی کی جھلک سے ٹٹول ٹٹول کر چلنے والو! کھلتا ہوا پتہ گویا دو دن کی بہار تھا۔ جو پھر دفعتاً نظر سے گر گیا اور نظر سے گرتے ہی جل کر تھالے میں آپڑا۔ جہاں سے ہوا نے اُسے زمین پر پھینک دیا اور دوسرے

دن جھاڑو کی سینکیں اُسے دروازے سے باہر بھی گر آئیں میں نے اُسے پھر جھوٹوں بھی نہ دیکھا کہ اس کی کیا نوبت ہوئی اور وہ کس درجہ کو پہنچا ۔

کیوں کسی غیر کا محتاج بنے او ناداں
ہونٹ سی لے کہ یہاں لذّتِ گفتار نہیں

بجھتا ہوا چراغ

رات کا سناّٹا - پچھلا پہر - سوئے سنسار اور جاگے پاک پروردگار - انسان تو انسان بہائم تک اس وقت اپنے اپنے مسکن میں جُگالی چھوڑے گردنیں ڈالے - آنکھیں بند کئے نیند کے مزے لے رہے ہیں خاموشیوں کا ہر طرف پہرہ ہے اور سائیں سائیں کا غیر معمولی آوازیں کبھی کبھی عَسس شہر کا نعرہ - ہاں ایک اور چیز بھی ہے جس کی ٹکور سے ساڑھے سات منٹ بعد کچھ نبند ہلی سی پیدا ہو جاتی ہے یعنی گھڑیال - چھوٹے بڑے درخت سب کے سب اقامت میں ہیں اور پرندان کی گود میں منقار زیر پر کا نمونہ - آہ ٹھیک اُس وقت میری نظر بجھتے ہوئے چراغ پر جا پڑی جس کی لَو اب بالکل دھیمی ہو چلی تھی - اُس پر کسی قدر سفیدی اور زیادہ تر نیلاہٹ برسنے لگی تھی - جھلملانا - بھڑکنا - یا اس کی پھیلی

ہوئی بے نور پھیکی روشنی گویا گھڑی ساعت کے ہوا کھانے والے
مریض کے چہرے کی مُردنی تھی کہ ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ کبھی
زیادہ تموُّج اُس کے رخصتی منظر کو کسی قدر چمکا دیتا تو بالکل یہ معلوم ہوتا
تھا کہ اُس نے اب سنبھالا لیا ہے اور کوئی دم کی ہوا ہے اور جہاں
ایکا ایکی غضب کی افسردگی چھا جاتی اور یوں ہی سی کچھ جھلک رہ جاتی
تو بے اختیار زبان سے نکل جاتا۔ اے لو! بس وہ ٹھنڈہ ہو گیا۔
کمزور، بہت ہی کمزور، پٹ بند کمرے کی تھوڑی بہت ہوا کے
سہارے یوں ہی کچھ اِدھر اُدھر بڑھتی اور پھر مٹ مٹا کر برابر
ہو جاتی۔

کیا یہ کسی ناشاد نامراد کا چراغ گور تھا؟ جس پر حسرتیں ٹوٹی
پڑتی تھیں بہتیرا سنبھالنا چاہتی تھیں۔ پروانے گر گر کر بتّی اُکساتے
تھے مگر ذرا اثر نہ ہوتا تھا۔ ہائے اور اُسی ویرانہ ہُو کا مقام اور اک
حسرت بھرے کی قبر پر اک ناکام تمنا کی تربت پر سوائے کُمھلائے
ہوئے پھولوں کی چار پتیوں اور اس جھلملاتے ہوئے چراغ کے
اور کچھ نہ تھا۔ لو وہ بھی ہو چلا۔ شاید تیل ہو چکا ہے۔ بتی خشک ہو گئی

پروانوں نے جل جل کر ڈوب ڈوب کر رہی سہی نمی کو بھی جذب کر لیا اور اب سوائے بے کسی کے کوئی یہاں کا نگراں نہ رہا۔ اے ہوا کے نچلے نہ رہنے والے ہاتھ ذرا تھم تھم کر چل۔ اور غریبوں کی اس آخری نشانی کو بھی مٹا کر ان کا صبر نہ سمیٹ۔ نہیں نہیں۔ یہ کسی دیو استھان کسی متبرک مندر یا پاٹھ شالہ کا چراغ ہے۔ شام کی آرتی کر کے سب پجاری چلے گئے۔ تین پہر رات بھی گزر چکی۔ اب صبح نور کے تڑکے اُٹھنے والے گیانی دھیانی یہاں آنے والے ہیں۔ یہ بجھتا ہوا چراغ شاید اُن ہی کے آنے کا منتظر ہے۔ یا ان ہی کے جپ تپ کی روحانی قوّت اُسے اس وقت تک سنبھالے ہوئے ہے۔ نہیں تو اب تک کبھی کا بجھ جاتا۔ وہ آئیں گے بتّی اکسائیں گے پھر تیل ڈالیں گے اور رام نام کی مالا پھیریں گے۔ شاید ایسا ہو مگر اس کی جھلملاہٹ تو کسی چمپئی آنچل کے کنارے سے بہت مشابہ ہے۔ قطعی یہ کسی میٹھی مرادوں والی حسن کی دیوی کے فراق میں اس طرح دم توڑ رہا ہے۔

ضرور اس کے آنے ہی کا وقت ہے بلکہ روز کی بہ نسبت

آج کچھ دیر بھی ہو گئی ہو تو عجب نہیں ٹھہر ٹھہر او مہجور شب جدائی جب ساری رات تو نے انگاروں پر لوٹ لوٹ کر کاٹ دی تو اب ذرا سی دیر کے لئے ایسا جی چھوڑ دینا ہے۔ بس اب کوئی دم میں طاؤس طناز گھونگٹ نکالے۔ چومک لئے چھم چھم کرتی آئے گی خندق حنا بستہ سے تری بتّی اونچی کرے گی۔ جُوڑا کھولے گی۔ عطر افشانی کرے گی رخساروں کا پسینہ انگاروں پر تیل برسائے گا۔ پھر تجھے بھی کچھ حصّہ مل جائے گا۔ اور صبح تک میٹھے میٹھے بول دبی دبی زبان سے ادا ہوتے رہیں گے۔ اور اگر یہ نہیں تو کسی عابد مرتاض۔ زاہد شب زندہ دار کی تنکوں کی منڈیا کا دو کوڑی کا لعل ہے۔ جسے آپ کے مقدس ہاتھوں نے ہر شام تو روشن کر دیا۔ نصف شب سے زیادہ تسبیح و تحلیل میں گزار کر بہ تقاضائے بشریت اس وقت گھڑی بھر کے لئے آنکھ جھپک جانے نے اس عالم کو پہنچا دیا ہے۔ یہ دھندلی روشنی بھڑک کر مٹتے مٹتے بھی اپنے افزائش دہندہ کو یاد کر رہی ہے۔ لپٹ نہیں ہے گویا زبان حال ہے جس سے برابر اس سپید دھے بسا دے شعر کی تکرار

ہو رہی ہے ؎

جب گیا جوگی منڈیا چھوڑ کر
پھر نہ آیا وہ کہیں پر رم رہا

لیکن نہیں اے بجھتے ہوئے چراغ یہ لفظ گو پر معنی ضرور ہیں مگر تو اس وقت بے موقع استعمال کر رہا ہے۔ جوگی ابھی نہیں گیا۔ مقدّس عابد نے ابھی خدانخواستہ منڈیا نہیں چھوڑی وہ ذرا کی ذرا کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گیا ہے۔ وہ اب اٹھا اور تجھے پھر اوجال دیا۔ اُف یہ بھی نہیں اب میں سمجھا کہ یہ بجھتا ہوا چراغ کیا چیز ہے؟ نہ یہ کمرے کی رونق۔ نہ یہ لوحِ تُربت کا نُور نہ یہ مندر کی جوت۔ نہ یہ کسی تارک الدُّنیا کی گپھا کا دِیا۔ بلکہ یہ تو میرا ہی کمبخت بدنصیب دل ہے جو اب بجھتا چلا ہے اور اب میری خوشی بھری زندگی کا آخری وقت ہے ؎

ہوئے سیہ سپید ہوئے ہیں شباب میں
اے زندگی! ابھی سے چراغِ سحر نہ ہو

ٹوٹا ہوا ہاتھ

میں ایک دن اک شبنم آلود صبح کو دریائے جمنا کے اُس کنارے پر جا نکلا جہاں سے بیلا بالکل قریب ہے وہیں ایک جگہ ریت میں ایک جوڑدار سفید سی چیز پڑی ہوئی دیکھی جس کو پہلی نظر میں، میں جنگل کی کوئی بل کھائی ہوئی لکڑی سمجھا لیکن نہیں جب میں نے اُسے اُٹھا کر غور سے دیکھا تو وہ انسان کا تمام و کمال بازو تھا۔ جل وجلالہٗ وجل شانہٗ۔ کیا کوئی انسانی نگاہ اپنے ایک عضو کو اِس حال سے دیکھ کر آپے میں رہ سکتی ہے؟۔ ہرگز نہیں جن کا دل حکمت و معرفت سے لبریز ہے اور جو اُس کی ہر شان کا جلوہ نظر میں رکھنے کی کافی قابلیت رکھتے ہیں وہ بے شک میرے ہم خیال ہوں گے ورنہ کوربا طنوں سے تو میں مخاطب بھی نہیں ہوں۔ وہ ہاتھ کیا تھا؟ دکھ بھری کہانی کا ایک ٹوٹا ہوا فقرہ تھا۔

مجھے یہ تو نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ اپنے جسم سے جدا کر کے کہاں سے کہاں پھینکا گیا ہے یا اس کے جسم کا ہر عضو اسی طرح تقدیر کے ہاتھوں مختلف جگہ تقسیم ہو چکا ہے۔ اس کا پوست کہاں گیا۔ اس کی انگلیاں کیا ہوئیں۔ اس کی رگوں کا لچھا کیوں توڑ کر پھینک دیا گیا۔ اس کا گوشت کیڑوں نے کب کھایا مگر ہاں اتنا میں ضرور سمجھ گیا کہ جو حال اس کا ہوا ہے وہی حال ایک دن میرا بھی ہو گا۔ یہ بھی انسان تھا اور میں بھی انسان ہوں۔ میری صبح کی طرح اس کی صبح میری شام کی طرح اس کی شام۔ اور میری ہی طرح یہ بھی اپنے دن کے گھنٹے گزارتا ہو گا۔ اس کا جسم بھی ایسا ہی قوی ہو گا اور اس بازو کا مالک بھی میری ہی طرح کبھی اس زمین پر ضرور چلتا پھرتا ہو گا۔ آہ!۔ آج وہ اپنے تمام جسم سمیت غائب ہے۔ اور اس کا صرف ایک نشان یہ اس طرح میرے سامنے موجود ہے ظن غالب ہے کہ کل میں یا میرا کوئی حصہ کسی کے سامنے اسی طرح پڑا ہو گا بلکہ شائد مجھ جیسا اس کا دیکھنے والا بھی نہ ہو دوسرے اس ہاتھ سے تو میں بالکل ناواقف ہوں۔ کیا عجب ہے جو یہ کسی کریم النفس کا ہاتھ ہو۔ کسی سخی کا ہاتھ ہو کسی بہادر کا بازو ہے

زبردست ہو کسی فرماں روا کا دستِ شہ زور ہو یا کسی نازنین کی صندلی کلائی ہو لیکن ہاں اس کے مقابلے اپنے ہاتھ کو تو میں خوب جانتا ہوں جس نے کبھی کوئی خوبی نہیں دکھائی ۔ یہ خیال کرتے ہی میں لرز لرز گیا کیونکہ میں خوب جانتا تھا کہ میرا ہاتھ جب کبھی بڑھا ہے تو گناہ کی طرف ۔ جب کبھی اشارہ کیا گیا ہی تو برائی کی طرف ۔ جہاں تک میں حد سے زیادہ گنہگار اپنا کبھی اندازہ کر سکتا ہوں اتنے ہاتھ کو اپنی وجہ سے سخت خطاوار پاتا ہوں ۔ میری ہستی نیستی ہے میں ہمہ تن نہیں ہوں ۔ اور میرا یہاں ہونا نہ ہونے کی دلیل ہے ۔ میں خاک سے بنایا گیا ہوں مجھ میں اس نے اپنی حیرتناک حکمت صرف کی ہے مگر میں یہاں آکر اپنے بنانے والے کو بالکل بھول گیا ۔ میں نے اِن ہاتھوں سے جو میری حفاظت میری ضرورت اور اس کی عبادت کے ارکان ادا کرنے کے لیئے دیئے گئے تھے ان سے وہ وہ ناجائز کام لیئے ہیں کہ جن کے خیال سے میرا رونگٹا رونگٹا لرز جاتا ہی ۔ میرے ہاتھ اکثر میری خواہش سے نہایت ہی ناپاک چیزوں کے چھونے کو بڑھے ہیں ۔ میرے ہاتھ میرے حکم سے بھی نچلے نہیں رہے ۔ اور میں ان کا خاک ہو جانا ہی بہتر سمجھتا ہوں ۔ لاموجود الا اللہ ۔

انیسؔ و دبیرؔ

مرثیہ نگاروں کے سرتاج حضرات انیسؔ و دبیرؔ کے متعلق بڑی بڑی چہ میگوئیاں ہو چکی ہیں اور اُن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر میری ناقص رائے ہیں وہ دونوں بزرگوار ہمارے فیصلے سے مستغنی ہیں۔ بس صرف اِسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ وہ حضرات ہر اعتبار سے تمام ایشیا کے سرمایۂ ناز و افتخار تھے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم یورپ کی تقلید میں جان و مال تک لگا دیتے ہیں لیکن اپنے لاثانی مشاہیر کی جانب آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ شیکسپیرؔ اور ملٹنؔ کے رونے والو ذرا ادھر بھی تو توجہ کرو۔ اپنے فردوسیٔ اُردو میر ببر علی انیسؔ اور میرزا دبیرؔ علیہ الرحمہ پر ایک نظر ڈالو۔

میرے خیال میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا کسی طرح درست نہیں بس فرق صرف اسی قدر ہے کہ میر انیسؔ

ایک ایک لفظ کو سو سو دفعہ جانچ کر نگینے کی طرح بٹھاتے ہیں اور جو لفظ جہاں زیب نہیں دیتا اُس کے ردّ و بدل میں راتیں کالی کر دیتے ہیں۔

برخلاف اُن کے میرزا دبیر ایک بحرِ ناپیدا کنار ہیں جن کو شیر کی طرح اپنی طاقت کی مطلق خبر نہیں وہ جہاں چاہتے ہیں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی قادر الکلامی سے لفظوں کو مطیع بناتے چلے جاتے ہیں۔ ہاں البتہ اُن کو اتنی مہلت نہیں ملتی کہ اپنی مفتوح مخلوق کو مڑ کر ایک نظر دیکھ سکیں۔ ورنہ چہرہ رخصت۔ رزم و بزم، مرثیت کے گوشے۔ انداز طبیعت کا پینٹ کرنا۔

ہر مقام پر ایک دوسرے کے برابر برابر ہو کر نکل گئے ہیں۔ کہیں کہیں انداز بیان اور روا روی میں کوئی دوسراہٹ ہو جاتے تو ہو جائے یہ زیادہ قابل اعتبار بات نہیں۔ بہر حال وہ انیس ہیں اور وہ ہر حال میں دبیر۔

خانہ بدوش

یک لُنگ زیر و یک لنگ بالا
نے غم دُزد و نے غم کالا

غدر کے بعد سرکارِ انگریزی کے عملدرآمد سے جہاں ہندوستان بھر میں بہت سی بدعنوانیوں کا کھوج مٹ گیا ہے وہیں خانہ بدوشانہ زندگی بھی قریب قریب مفقود ہوتی جاتی ہے۔ تاہم اب بھی اکثر جپسی Gipsy قومیں ایرانی نژاد جرگے اور چند خانہ بدوش فرقے کہیں کہیں ہندوستانی ریاستوں میں اب بھی رَمتے بھَمتے نظر آجاتے ہیں۔ دکن کے گونڈ اور بھیل۔ راجپوتانے کے بنجارے سانسی اور کنجر لوگ بھی اِسی ٹولی کے مشترک مخلوق ہیں۔ جن میں سے بعض اکثر گاؤں گنوے ہیں۔ کبھی کبھی ضرور گشت لگاتے ہیں۔ یہ مذہباً ہندو ہوتے ہیں۔ اور معاشرتاً غیر

جرائم پیشہ۔

بے شک یہ لوگ اُن نیم ایرانی فارسی بولنے والے عورت مرد کی طرح نہیں ہوتے جو جھوٹے فیروزے۔ نیلم۔ پکھراج۔ تسبیح کے دانے وغیرہ بیچتے پھرتے ہیں اور ذراسی بات پر لڑنے مرنے کو مستعد ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یہ لوگ لوہار پیشہ ہوتے ہیں۔ چاقو چھریاں۔ قینچیاں۔ توے۔ پرات بناتے ہیں۔ اور چھکڑوں میں لدے پھندے عورت مرد بچّے بوڑھے گاؤں در گاؤں پھرتے ہیں۔ چونکہ یہ جرائم پیشہ نہیں ہوتے اس لئے حکّام کی نگاہیں بھی ان سے اکثر چشم پوشی کرتی ہیں۔ یہ بھی ٹولیاں باندھ باندھ کر گھر بار، مال مویشی ساتھ لئے جنگل میں منگل مناتے ہیں۔ اور زیادہ تر زیرِ آسمان ہی رہنے کے عادی ہیں۔ اس لئے عورت مرد اُن کے اکثر قوی ہیکل صحیح اور تندرست بھی ہوتے ہیں۔ اُن کا تمام گھر بلکہ سب کنبہ اور اثاثلبیت ایک چھکڑے ہی میں ہوتا ہے۔ جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ گائیں۔ بھینس۔ بیل بھیڑیں بکریاں بلکہ کتّے تک ساتھ ہوتے ہیں جو اس قافلے کی رکھوالی رات دن کرتے ہیں۔ شہر قصبے یا گاؤں گنویں میں جہاں پانی دیکھتے ہیں۔ یہ

پڑاؤ ڈال دیتے ہیں۔ کسبِ معاش کا ذریعہ بظاہر کچھ لوہے کے برتن قینچیاں۔ چھریاں۔ توے۔ پرات ہوتے ہیں۔ انھیں کی طرح ایک اور بنجارہ قوم بھی ہوتی ہے جو تھوڑا بہت مال غلّہ وغیرہ لے کر بنج بیوپار کرتے پھرتے ہیں۔ جن کی بابت میاں نظیرؔ اکبر آبادی یوں فرما گئے ہیں ؎ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔ بس یہی وہ بے ضرر قوم صنعت و حرفت اور تجارت کرنے والی ہے جو اکثر راجپوتانہ میں رَواں دَواں دیکھی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک جگہ ٹِک کر نہیں رہتی بلکہ جہاں پانی ملا وہیں کچھ روز قیام کیا۔ بیچا کھوچا اور پھر قلا فلے کا قافلہ لاد پھاند کر آگے بڑھ گیا۔ ان کے متعلق ایک اور بھی روایت مشہور ہے۔ یعنی جب اُودے پور کے مہاراجہ رانا سانگہ کے مارے جانے کے بعد رانا پرتاپ کو بھی امن نصیب نہ ہوا تو انھوں نے یہ عہد کیا کہ جب تک ہم اپنی گذشتہ عظمت نہ حاصل کر لیں گے ہمارے ملک پر دوبارہ ہمارا قبضہ نہ ہو جائے گا اُس وقت تک برابر ہم اور ہمارے جانشین نہ تھالی میں کھائیں گے نہ پلنگ پر سوئیں گے۔ بلکہ اس وقت تک برابر اسی طرح رَواں دَواں ہی

پھریں گے چنانچہ یہ بنجارہ قوم بھی انھیں کی مقلّد ہے۔ یہ بھی کسی مقام پر مستقل سے نہیں بیٹھتے۔ ان کا قافلہ بھی رات دن خود ساختہ چند گاڑیوں یا جھکڑوں کا زنجیر بند قلعہ ہوتا ہے۔ جو اپنا سب سامان مال اور مویشی لے کر آج کے دم تک متحرک محلّے کی طرح چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ ہر گاڑی پر نصف سے زیادہ سرکیاں اور کچھ پردے پڑے ہوتے ہیں۔ ضروریاتِ زندگی میں سے پلنگ۔ پیڑا۔ چکی۔ چُولہا۔ موت زندگی کا سامان۔ شادی بیاہ رچانے کا ٹِک ٹُک سب کا سب جنگل در جنگل اُٹھائے پھرتے ہیں اور جہاں رات ہوگئی وہیں ٹانڈہ ڈال دیتے ہیں۔ جہاں شام ہوگئی یا دو چار دن کے قصد سے قیام کر لیا آبادی سے دور یا کسی نہر یا تالاب اور کنوئیں کے کنارے کھُلی ہوا میں مقام کی سوجھی۔ بس وہیں پڑاؤ پڑ گیا۔ چکیاں چلنے لگیں، مرد حقّے۔ ناریل۔ ڈڑ خمے لیکر بیٹھ گئے اور دھوئیں اُڑانے لگے۔ انھیں لوگوں کو سادہ غذا۔ سخت محنت اور آزادی کی قیمت خوب معلوم ہے۔ یہ لوگ شہروں کی آبادی۔ دھوئیں گرد و غبار سے دور رہتے ہیں۔ بڑے بڑے اونچے اونچے محل۔ ہال کمرے

اور ڈرائنگ رُوم وغیرہ اور ان کی زیبائشیں ان بیچاروں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھیں۔ فرقہ بندی۔ بائیکاٹ۔ نان کاپریشن ان کی ڈکشنری میں ایسا ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔ ایک بنجارے کے لئے اگر دنیا بھر میں کوئی چیز عزیز ہے تو وہ اُس کی وہی بے ڈھنگی۔ لوہا۔ لاٹ بیل گاڑی ہی ہے جس کی ساخت اور کاریگری کا بھی وہی اکیلا ضامن ہے۔ جس کے بھاری بھاری پہیئے۔ دُھرے بلکہ سارے کَل پُرزے اُس کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر ایک بنجارہ ایک ہی وقت میں نجار بھی۔ لوہار بھی اور تاجر بھی۔ بس جہاں کہیں بھی خدا کی زمین پر اس کا وہ چھکڑا کھڑا ہوگیا۔ سواریاں اتر پڑیں۔ مال۔ مویشی چوپائے سب اپنے اپنے ٹھکانے باندھ دیئے گئے۔ عورتوں نے مردوں کے لئے کھٹولے چٹائیاں۔ بوریاں۔ ہرکیاں یا ٹاٹ کے ٹکڑے جھپ جھپ نکال کر بچھا دیئے اور آپ چکی چولھے میں لگ گئیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے سوکھی لکڑیاں اوپلے ڈنگریاں سمیٹ لائے۔ کوئی اُدھر سے پانی کا گھڑا لئے چلی آتی ہے۔ کوئی اِدھر سے گائے بھینسوں کو دوہنے کے لئے ایک طرف کو لے نکلی۔ یکایک تندور روشن

ہوئے یا چوٗلھے سُلگے۔ جگہ جگہ گھُمر گھُمر چکیاں چلنے لگیں اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جَو، جُوار، باجرہ، مکّی، چاول، گیہوں جو رزق جس کو میسّر ہوا آٹا پیس۔ مٹی کے کونڈوں اور پراتوں میں سجا پکا رینددھ شام کے آٹھ نو بجتے بجتے ہر گھر والی نے آٹھ دس موٹے موٹے ٹکّڑ اپنے اپنے مردوں اور بچّوں کے سامنے لا رکھے۔ اور سارے قافلے نے اپنی اپنی جگہ بیٹھ اپنے تن تازہ کر لئے اور محنت کے بعد گھوڑے بیچ کر سو گئے۔

دوسری صبح اور سارا دن

پچھلی رات سے پھر چکیاں چلنے لگیں اور پرندوں کے چہکنے سے پہلے پہلے وہ محنت کش عورتیں پھر قیامت کی طرح اٹھیں۔ ضروریات سے فارغ ہوئیں۔ بچّے والیوں نے بچّوں کو دودھ دیا۔ ان کی ضرورتوں سے چھٹی پائی اور ان کو گود میں لئے لئے پتھر سے پتھر رگڑنے لگیں۔ بعض بعض رنگیلی ہاتھ کو سہارا دینے کے لئے آہستہ آہستہ گاتی بھی جاتی ہیں۔ بعض عبادت کے طور پر بھجن اور دوہے بھی گنگناتی

ہیں اس طرح دو ہاتھوں سے دو کام لیتے لیتے ان کو عمریں گزر گئی ہیں آخر صبح کی پَو پھٹتے پھٹتے وہ اپنے روزانہ کام سے فارغ ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد وہ تاروں کی چھاؤں اور پرندوں کی چہچہاہٹ میں برتن بھانڈے لیئے اپنی بکریوں۔ گائے بھینسوں کا دودھ دُہنے میں مشغول ہو گئیں۔ اب بیکار بڈھے اُٹھتے ہیں۔ کیونکہ ان کو بھی ایک کام ہے۔ وہ بھی اٹھے اور ضرورتوں سے فارغ ہو کر۔ مال مویشی کو ہکا کر چرنے چگنے کے لئے جنگل کا رستہ لیتے ہیں۔ شدہ شدہ کامی اور محنت کش جوانوں کی باری آئی وہ اُٹھے اور وہیں اپنی اپنی گاڑیوں کے پاس ہی بھٹیاں تیار کرنے لگے ان میں ایندھن ڈال دھونکنیاں لگا دی گئیں چھوٹے بڑے بچے بھی آشامل ہوئے۔ خوب خوب دھونکنیاں دھونکی گئیں۔ اور تھوڑی دیر میں آگ کے شعلوں نے منوں لوہا پانی کر دیا۔ جن کو سانچوں میں ڈھال کر طرح طرح کے سازوسامان بننے لگے۔ گھن پر گھن پڑنے لگے۔ نہائیاں کوٹی پیٹی گئیں اور گھنٹوں ٹھونک پیٹ کا بازار اس طرح گرم رہا کہ کسی کو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ اس طرح توے۔ پرات۔ چاقو۔ چھُریاں۔ سرد طے بنا بنا کر بازار اور پینٹھ

جانے والے تیار ہو گئے۔ دوپہر ڈھلتے ڈھلتے پھر پیٹ پوجا ہوئی اور مخصوص مرد و عورت جن کے ذمے بازار میں مال کا لیجانا تھا وہی اپنے اپنے وقت پر سب سامان لے کر بازار چلے گئے۔ خدا خدا کر کے دن تمام ہوا اور شاموں شام مال بیچ کھوچ کر نیا

- سامان اور خورد و نوش کی ضرورتوں سے لدے پھندے پھر وہی لوگ اپنے اپنے ڈیروں پر ہنستے کھیلتے واپس آ گئے۔

جل ترنگ

اس سے پہلے کہ میں اس نئے مبحث پر کچھ لکھوں میں اپنی طبیعت کی مناسبت کا کچھ ذکر کرنا چاہتا ہوں جو موسیقی سے مجھے ہے یا کبھی تھی۔ بدقسمتی سے میں بالکل ٹونگا بے سُرا واقع ہوا ہوں موسیقی تو درکنار مجھے پوری سَرگم بھی کبھی یاد نہ ہوئی۔ باوجودے کہ نرم نرم پولے پولے ہاتھوں سے ہارمونیم سیکھتے وقت انگلیوں پر صدہا پنکھے پر پنکھے بھی کھائے مگر ان ناشدنی انگلیوں سے کبھی ایک بول بھی ادا نہ ہوا۔ ہاں البتہ عالم رنگ و بو میں رسیلی و سُریلی تانیں اکثر دل کو لبھایا کرتی تھیں۔ اور ایک خاص اثر تو اب بھی کبھی کبھی پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کوئی رنگیلی چٹکیلی آواز سنائی دے جاتی ہے۔ بس اللہ اللہ خیر صلّا۔ اس سے زیادہ نہ کبھی مجھے دست رس ہوئی اور نہ میں کچھ جانتا ہوں۔ ہاں بیان

کرنے والوں سے سُنا ہے کہ فن موسیقی کے اساتذۂ قدیم نے صرف چار قسم کے باجے ہندوستان میں ایجاد کیئے۔ اور ان کی قسمیں صرف ان چار لفظوں پر محدود کردیں۔ تَت۔ بِتَت۔ گھنّ اور سکھر۔ تَت یعنی تار کا باجا جیسے سارنگی۔ طاؤس۔ ستار وغیرہ تیرت یعنی تانت کا باجا جیسے وائیلن۔ فڈل۔ دلربا وغیرہ۔ گھن وہ باجا جو چوٹ اور ہاتھ کی ضرب سے بجایا جاتا ہے۔ مثلاً نقّارہ طبلہ۔ پکھاوج وغیرہ۔ اور سکھّر یعنی پھونک کا باجا مثلاً شہنائی بین۔ بانسری۔ الغوزہ اور نس ترنگ وغیرہ مگر جل ترنگ ان سب سے الگ ہے۔ اس میں نہ تار ہیں نہ تانت نہ پھونک اس لئے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ جل ترنگ ان قدیم باجوں کے بعد کی ایجاد ہے۔ اور ان سے پہلے ہی فنا بھی ہوجانے والی ہے۔ کیونکہ اس کے جاننے والے شاذونادر ہی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

بجانے کی ترکیب

البتّہ بظاہر جل ترنگ کے لئے ساز و سامان کی کچھ ضرورت

نہیں۔ تھوڑا سا پانی اور دو چھوٹی چھوٹی لکڑیاں کافی ہیں۔ چینی کے پیالوں کی تعداد جتنی جی چاہے وسیع کر سکتے ہیں۔ مگر ان کا صحیح اندازہ۔ بجانے والے کی قابلیت اور اُس کے دل و دماغ سے تعلق رکھتا ہے۔

اس میں مکمل باجوں کی طرح پورے سات سُر ہیں۔ اور پھر مشاق استاد اِنہیں سات سُروں کے اتار چڑھاؤ سے سینکڑوں صدائیں پیدا کر لیتے ہیں۔ جل ترنگ نواز ایک مسطح فرش پر صدر میں بیٹھتا ہے اور ارد گرد اُسی سرگم کے پھیلاؤ سے بہت سے چینی کے پیالے پانی سے بھر کر رکھ لیتا ہے دو چھوٹی چھوٹی قلمیں یا بانس کی چھڑیاں اس کے دونوں ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔ ایک طرف ستار نواز بیٹھتا ہے۔ طبلہ اور ہارمونیم یا سارنگی سے آس دی جاتی ہے اور آپس کی چھیڑ چھاڑ سے سُر ملانے شروع ہوتے ہیں۔

ستار نواز پہلے گت شروع کرتا ہے۔ جل ترنگ نواز اس کا جواب دیتا ہے۔ طبلہ نواز تال کا ہمرنگ رہتا ہے اور ہارمونیم نواز یا سارنگی والا برابر سُر کی آس دیئے جاتا ہے۔ بس اس طرح

ان سروں کے جھرمٹ میں مشاق جل ترنگ نواز پہلے سُر قائم کرتا ہے اور جب تک سُر قائم نہیں ہوتے وہ برابر پیالے کا پانی کم و بیش کر کے انھیں چھوٹی چھوٹی چھڑیوں کو پیالوں پر مار کر سُروں کے چڑھاؤ اتار کا اندازہ کرتا رہتا ہے جب وہ کسی پیالے کو بجا کر اس میں سے پانی کم کرتا ہے تو سُر چڑھ جاتا ہے اور جب پانی ڈال دیتا ہے تو سُر اُتر جاتا ہے۔

میرے خیال میں یہی ایک مشکل سنجیدگی ہے جو جل ترنگ نواز کی فہم و ادراک سے تعلق رکھتی ہے۔ باقی سب چابک دستی اور ہاتھ کی صفائی اور بجلی کی طرح دَوا دَوِش ہے۔ جس قدر مشق بڑھائی جائے گی اُسی قدر سما باندھنے کی قدرت پیدا کر لی جائے گی۔ الغرض جب تمام ساز ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جاتے ہیں تو ستار نواز گت شروع کرتا ہے۔ جل ترنگ نواز اس کا معاً جواب دیتا ہے۔ اور وہی گت اُن لکڑیوں کی چھیڑ اور پیالوں کی جھنکار سے بجنسہ پیدا کر کے دکھا دیتا ہے۔ واقعی یہ بہت بڑا کمال ہے۔ رفتہ رفتہ عالم کیف بڑھتا جاتا ہے۔ مکان بند ہو اور آواز کو گونجنے کا موقع

ملے تو پھر اس باہمی مقابلے کی کیفیت بس انسان کو بہشت بریں میں پہنچادیتی ہے۔

اب ستار نواز رہ رہ کر جھنجوٹیاں لیتا ہے۔ جل ترنگ نواز اس سے بڑھ کر اپنے آپ کو دکھانا چاہتا ہے۔ بس پھر تو آپس میں وہ وہ گرم جوشیاں ہوتی ہیں جیسے دو بُلبل گتھے ہوئے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو پالی میں سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ ابھی چند روز کا ذکر ہے خوش قسمتی سے یہی سما میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سُنا۔

میرے ایک مہربان سرکار جھالاواڑ کے ارباب نشاط میں سے ایک فرد فرید روزگار صادق علی خاں بین کار اس دعوت کے بانی ہوئے۔ میں اس مختصر سی انجمن کی تصویر لفظوں میں کس طرح کھینچ سکتا ہوں۔ سمجھ لینے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ چھوٹا سا بند کمرہ تھا سُروں کے دریا بہہ رہے تھے اور میں معہ چند حاضرین کے ان میں غوطے پر غوطے کھا رہا تھا۔

البتّہ گت بدلنے کے لئے جب آنکھ کھلتی تھی تو بے شک یہ دکھائی

دیتا تھا کہ ظالم صادق علی کے ہاتھ میں ستار ہے۔ جادوگر جل ترنگ نواز نے صرف پیالیوں کی جھنکار اور دُوگن تگن کی دلچسپی سے سُن کردیا ہے۔ طبلہ اور ہارمونیم خاموشی اور فریاد کے ساتھ سنگت کر رہے ہیں۔ اور سامعین ہیں کہ بُت بنے بیٹھے ہیں اور کسی کو کسی کی خبر نہیں۔

رضا علی خاں جل ترنگ نواز اگر اپنے فن میں بے نظیر تھے تو صادق علی خاں نے بھی اپنی ایک انگلی سے زمین و آسمان ایک کر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ دونوں کے ہاتھ گویا سونے کے ہاتھ تھے جن کا مثل و نظیر میں نے تو اب تک دیکھا نہیں۔

عالمِ کیف کا بلا مبالغہ یہ عالم تھا کہ زمین و آسمان سے سُر ہی سُر برس رہے تھے۔ عالمِ وجد طاری تھا اور گویا ہر ایک روحِ انسانی اس وقت علیٰ قدرِ مراتب سُروں کے سمندر میں تیر رہی تھی۔ کامل دو گھنٹے مجھے اسی نشے میں گزر گئے۔ آخر چار و ناچار وہاں سے اُٹھا اور سُروں میں ڈوبا ہوا اپنے دار الحزن میں واپس چلا آیا۔

چاندنی رات اور دریائے راوی

جاڑوں کی چاندنی رات جو مفلس کی جوانی کی طرح بہت کم دیکھی جاتی ہے اس وقت ہماری عنانِ توجّہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ گو سناٹا خاموشی اور موسمی برودت، ان تینوں چیزوں نے مل جُل کر ہر ذی روح کو اس وقت ساکن رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مگر نبض کی حرکت تنفس کی آمد و شد اور سنناتی ہوئی ہوا کے جھونکے اس وقت بھی ایک وحشی مزاج سیاح کو اڑائے لئے چلے جاتے ہیں۔ دریائے راوی کا وہ ٹکڑا جو بادشاہی مسجد سے کچھ دُور آبادی اور عشق مجسّم بادشاہ جہانگیر کی چاہیتی بیگم نور جہاں کے مزار کے درمیان حائل ہے ایک دھیمی رفتار سے اس وقت بھی لہریں لے رہا ہے۔ جنگل بیابان ہُو کا مقام پچھلا پہرا۔ موجودات کا محوِ خواب ہونا چمکتے ہوئے تارے نیلا نیلا آسمان، چاند کا روشن چہرہ اس کے گرد

ایک بڑا ہالا کنارہ دریا دو طرفہ سے گنجان درختوں کی پھننگیں شاہی محلوں مناروں اور برجوں کی نوکیں چوٹیاں اور کلس۔ چاندنی کا نرم اور اوس سے گیلی ریت پر چاروں طرف کھلا نظر آتا۔ یہ منظر تھا جو شب گرد سیّاح نے دیکھا اور اُسے ایکا ایکی یاد آگیا کہ وہ اس وقت کہاں ہے اور کس عالم میں ہے؟ یہ وہی دریائے راوی ہے جو پنجاب کے قیام کے موقع پر ہندوستان کے مشہور خوش نصیب شہنشاہ نور الدّین جہانگیر کی سواری اکثر ایسے ہی وقت یہاں آیا کرتی تھی۔ چاندنی کی بہار، خدام کی قطار۔ ہیلوں مشعلیں روشن ہوتی تھیں۔ دریا کے قریب آکر خدم وحشم رخصت اور خود بدولت جھومتے جھامتے ہوادار سے اُترتے تھے۔ بیگم سنبھالتیں اور دونوں بغلگیر خراماں خراماں چلتے۔ بیگم کونسی بیگم روحِ روانِ جہانگیر جانِ جہانگیر بلکہ دین وایمان جہانگیر اپنے وفا شعار قدردان کو جان کی طرح لئے دیئے سیر کراتیں کشتیاں دوڑتیں چپو چلتے۔ گلابیاں ڈھلتیں اور شہنشاہ ہندوستان ایک سلطنت، دوسرے شباب، تیسرے ایسی حسین ملکہ کا تقرب ان تین تین نشوں میں چور داد عیش دیتا۔ کبھی لبِ دریا

شہ نشین میں مکلف فرش بچھتے زرکار شامیانے کھینچے جاتے آرائشیں قائم ہوتیں فانوس اور کنول روشن ہوتے۔ آتش بازیاں چھٹتیں ساغر چلتے رام رنگی اڑتی گلاب ملایا جاتا چسکیاں لگتیں گزک لعل رُمانی کی آبداری دے جاتی اور اسی چاندنی کو صبح تک سورج کی کرنوں سے ملا دیا جاتا مگر افسوس آج نہ وہ ہیں نہ ان کا زمانہ۔ یہ مقام ان سے ہمیشہ کے لئے چھٹ گیا۔ یہ موجود ہے اور وہ خاک میں مل گئے۔ جہانگیر اور نورجہاں کا نام ہی نام ہے۔ دریائے راوی اور اس کا یہ منظر زندہ لوگ آ آکر دیکھتے ہیں زمانہ بدل گیا۔ وقت پر وقت گزر گیا بلندیاں پستی کی طرف گریں۔ پستیاں بلندی کی طرف صعود کر گئیں دریا خاک۔ خاک خاکِ تودہ اور خاکِ تودہ کنکر اور کنکر پہاڑ بن گئے مگر ان کی صورت بھر دیکھنے میں نہ آئی۔ ہاں اسی دریا کے قریب اس حسین اور عقیل ملکہ کا اک مٹا مٹا نشان اب تک موجود ہے۔ دریا کو کشتیوں کے پُل سے عبور کرو۔ پھر سڑک کا تھوڑا سا فاصلہ طے کرو۔ ایک شکستہ عمارت کے سامنے جا کھڑے ہو گے۔ احاطے کی چار دیواری میں جو پہلا دروازہ ہے اس میں سے داخل ہو تو اجڑے

رنگیلا جوگی

ہندوستان کے مغرب میں، اسٹیمر کی رفتار کے مطابق بمبئی سے سات آٹھ گھنٹے کی مسافت پر ایک قلعہ بیچ سمندر میں دکھائی دیتا ہے۔ یہیں ایک عظیم الشان پہاڑ کے دامن میں جس کی جھلسی ہوئی آدھے سے زیادہ چٹانیں آگ سے تپ رہی ہیں۔ نچلے حصے کے چھوٹے چھوٹے خودرو درختوں کے سائے میں۔ ایک نکیلی مگر سپاٹ چٹان پر گیروے کپڑے پہنے ایک حسین نوجوان بیٹھا ہے۔ یہ گرمیوں کی شام کے چھ بجے کا وقت ہوگا۔

اسی چٹان پر جس پر وہ رنگیلا جوگی بیٹھا ہے تقریباً دو سو فٹ کے فاصلے پر اوپر کی طرف ایک پختہ چار دیواری بھی گھری ہوئی ہے جس کے دروازے پر شاید اسی کے دو ہم سفر یا رفیق نوجوان عام سفید کپڑے پہنے ننگے سر اُوداس اُوداس بیٹھے ہیں اور اپنے چاروں

ہوئے چمن کو چھوڑ کر سب سے پہلے ایک ملگجے برج پر نظر پڑتی ہے جس پر کہیں کہیں گھاس بھی اُگی ہوئی ہے۔ اِمتدادِ زمانہ بتا رہا ہے کہ یہ کوئی پرانی یادگار ہے۔ یہی نور جہاں بیگم کی قبر ہے جس کو کبھی ہندوستان کی ملکہ کہتے تھے۔ جس کی جگہ ہر وقت جہانگیر کے دل میں تھی جس کے کپڑوں میں الماس زُمُرّد اور لعل و گوہر ٹکتے تھے آج ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں دفن ہے ؎

پردہ داری می کند بر قصرِ قیصر عنکبوت
بُوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

طرف گھبرا گھبرا کر متوحش نگاہوں سے دیکھتے بھی جاتے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نا تجربہ کار نوجوان رات کی تاریکی کی آمد دیکھ دیکھ کر ایسے مخدوش مقام پر بسرام کرنے کی فکر میں ہیں کیونکہ سوائے خدا کے یہاں کوئی آس ہے نہ پاس۔ توشہ نہ منزل کا بھروسہ مگر وہ شخص جوان سے زیادہ مسن ہے اور ان سے زیادہ باہمت جوان بھی معلوم ہوتا ہے اس کے چہرے سے مسرت کے آثار نمایاں ہیں اور موجودہ شام کی آمد آمد کی رنگا رنگی اسے بالکل بے فکر دکھا رہی ہے۔

وہ بیٹھا ہے اور نچنت بیٹھا ہے۔ اُس کے کرتے کا گریبان پھٹا ہے۔ مگر اسے کوئی پروا نہیں وہ بار بار اپنے پھٹے کُرتے کے گریبان پر ہاتھ مارتا ہے اور اس شعر کا اعادہ کرتا جاتا ہے ؎

چادر چڑھائی چاکِ گریبان نے پھول سی
لاکھوں بنا دئے گئیں یہ دھجیاں مجھے

اس کے داہنے ہاتھ میں اک نوک دار ٹہنی یا شاخ بھی ہے جسے گھس گھسا کر قلم کا کام لینے کو ٹھیک کر لیا ہے۔ پہلو میں ناریل کا

اک خول یا چھلکا بھی ہے جس میں کسی پہاڑی درخت کی چھال کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ زانو پر دبیز کاغذ کا ایک تختہ بھی ہے جو خدا جانے کن بے برگیوں میں اُس کے پاس پڑا رہ گیا ہے۔ اور اسی پر یہ اس وقت کے نظارے کو شاید قلم بند کر رہا ہے۔

بے شک یہ سُنسان مقام۔ یہ بحرِ ذخّار۔ یہ قدرتی صناعیوں کا بے نظیر مجموعہ جہاں زرد موتیوں کی ایک چھال بھی ایک مقام پر آ کر گرتی ہے۔ یہ شفقِ شام کا نیلے آسمان پر پھولنا۔ یہ حدِ نگاہ تک کوسوں اوپر نیلی چھت اور اس کے نیچے بحرِ عرب کا نیلم گوں پانی ہر دیدہ ور انسان اور فطرت کے کرشموں پر مر مٹنے والے دیوانوں کے لئے فی الحقیقت اک عجیب و غریب منظر ہے۔ ساتھ ہی اس کے یہاں برسات یا جاڑوں کی پہاڑ سی راتوں میں جب ٹہاوٹ پڑتی ہو گی تو ضرور بضرور یہ ڈراؤنا اور غیر آباد مقام دس بیس آدمیوں کے یکجا ہونے پر بھی ضرور روح فرسا ہو گا۔ کیونکہ یہاں درندے اور بہائم۔ سانپ اور بچھو جیسے انسانی زندگی کے دشمن۔ سرِ شام ہی اپنے اپنے

مسکن چھوڑ کر نکل پڑتے ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔

دراصل یہ جزیرہ حبشیان ہے۔ یعنی نوابان حبشی نژاد کا پایہ تخت شاید اسی قلعے سے مراد ہے۔ جو ساحلِ بحرۂ عرب پر اکثر وحشی قوموں سے آباد ہے۔ جن بھیل اور گونڈ ہی ہوں گی رنگیلے جوگی کا منہ مغرب کی طرف ہے۔ سامنے کی چٹانیں اور جھاڑیاں اور دور تک پھیلا ہوا ریتیلا کنارہ۔ اس کے بعد عظیم الشان بحر ذخار جس کا اور نہ چھور جو دُھر آسمان سے جا ملا ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ سامنے کے رُخ کوسوں دور تک دریائے نیل ہی معلوم ہوتا ہے۔ اللہ اللہ! اس لمبی لہکاری سیتل پانی کے نیچے کون کون سی مخلوق سانس لے رہی ہے؟ اس کے گہراؤ میں کیا کیا ہے؟ یہ سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اور پھر اس کی انتہا کہاں تک ہے؟ اس کو بھی کوئی نہیں جانتا۔ اُسی رنگیلے جوگی کا بیان ہے کہ میں اپنے دوران قیام میں اکثر شام کے وقت یہاں ٹہلا کرتا ہوں۔ لیکن میں نے سوائے اِکا دُکا نیلے رنگ کی وردی پوش پولیس کے اور کسی کو چلتا پھرتا یہاں نہیں دیکھا۔ البتہ بعض

بعض وقت پہاڑی کے اوپر یعنی کنارے سے سینکڑوں فٹ بلندی پر چند لنگوٹی بند بھیلوں ۔ اور ننگے دُھڑنگے سیاہ فام بلکہ فقیر جیسی ایک مخلوق کو ضرور دیکھا ہے ۔ بعض کے ہاتھ میں تیر کمان اور بعض بلم لئے تھے ۔ عورتیں بہت کم نظر آئیں ۔ مگر وہ بھی اسی طرح غرقی بند میلی کُچیلی سیاہ فام قریب قریب ننگی تھیں۔

ہاں ! یہ بات روزانہ دیکھی جاتی ہے کہ اک خاص وقت پر تقریباً دن کے دو بجے قلعے سے کسی توپ کا فائر ہوتا ہے اور چند کشتیوں کا جو تقریباً نیلی وردی کی پولیس سے مملو ہوتی ہیں قلعے سے باہر آنا جانا ضرور دیکھا جاتا ہے ۔ میں برابر دیکھتا ہوں یہ توپ کا چلنا گویا اک علامت ہے ۔ اسٹیمر کے ٹھہرنے کی یا اسٹیمر کے آنے کی ۔ جن میں سے بعض پر پرنس اور بعض پر راجپوری لکھا ہوتا ہے ۔ اس قسم کے جہاز اکثر دونوں طرف آتے جاتے ہیں بس اس کے سوا کوئی آبادی میں نے یہاں کہیں نہیں دیکھی شاذونادر اگر کوئی بھولا بھٹکا آدمی کی شکل راہ گیر اگر ادھر سے گزرتا بھی ہے تو میں اس کی بولی مطلق نہیں سمجھ سکتا ۔ کیونکہ وہ گجراتی یا تامل میں

بات کرتا اور میں اردو میں چناں وچنیں کر کے رہ جاتا ہوں۔ اس
ریتیلے کنارے سے لے کر پہاڑی چٹانوں تک بادام ناریل چھالیا
تاڑ شریفے انجیر کے خودرو چھوٹے بڑے درخت ہزارہا کی تعداد
میں اٹے پڑے ہیں۔ غالباً یہ اپریل مہینے کا آخری ہفتہ ہے اور
دوپہر کی جگر سوز تپش کے بعد اب یہاں سکون ہو گیا ہے۔ شام
کی آمد آمد ہے۔ یہیں سمندر میں دہنی طرف ایک اور چھوٹا سا پہاڑ
بیچ سمندر میں کھڑا ہے جس کے نیچے جا کر دن بھر کا تھکا ماندہ سیاح
ہمیشہ آرام لیتا ہے۔ گو اس سے پہلے بھی شفق شام کے منظر اکثر
دیکھے بھالے تھے۔ تاہم وہ نقل تھی نقل اور یہ اصل۔ چنانچہ جھٹ پٹا
ہوتے ہی وہ پانی کی نیلی چادر کا یکایک سیاہی مائل ہو جانا۔ اس
لمبی لہکاری چادر کو یونہیں کا یونہیں بچھا چھوڑ کر اگر افق پر نظر
ڈالیں تو وہ زنگار رنگ بادلوں کی گل کاری۔ وہ اُن بادلوں کے
ٹکڑوں کا ہوتے ہوئے اُتر کر بحرِ عرب کے دوسرے کنارے کو
گل زار کر دینا نقاشِ قدرت کی تصویریں نہیں تو کیا؟ غصیل سمندر
کے زہرِ ہلاہل پانی کا زور شور سے اُبلنا اور نگاہ کے فاصلے کو

موج در موج طے کر کے منہ سے کف برساتا قلعے کے بند دروازے اور اس کی دیواروں پر وہ ہینڈھے کا اچھلنا ۔ کس کس عالم کا ذکر کروں ؟ چاند کی دھیمی اور خوش گوار ٹکیہ کا آہستہ آہستہ اُسی پانی میں جھکولے کھانا ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کا چلنا ۔ سانولی سلونی رات کا چھا جانا ۔ ستاروں کا نکلنا اور ایک آسمان کے دو آسمان بن جانے ۔ یعنی جو اوپر تھا اُس کا عکس ہو بہو ۔ سمندر کی چادر پر نظر آنا ۔ مچھلیوں کا اُچھلنا ۔ لہروں کی دوڑ ۔

کیا پھر شفق پھولی ؟ سمندر کا مکھڑا ۔ ہلکا ہلکا گلابی کیوں ہو چلا ؟ نہیں نہیں یہ تو گلاب کے پھول ہیں ۔ جو جگہ جگہ تیر رہے ہیں ۔ لو وہ سین بھی بدل گیا ۔ اب اندھیری رات اندھیری زنگاری اپنا خیمہ لئے دُھر قلعہ کوہ سے اُتر گئی ۔ آگے آگے بڑھے گی ۔ اس کے بعد پچھلا پہرہ ہوگا ۔ پو پھٹے گی ۔ پرند چہچہائیں گے ۔ ابابیلیں جھومر ڈالیں گے ۔ شبنم میں ڈوبی ہوئی ہوائیں چلیں گی ۔ بھونرے گونج نکلیں گے ۔ شہد کی مکھیاں اُڑیں گی ۔ کلیاں چٹکیں گی اور پہاڑی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو دل

دماغ تازہ کر دے گی۔ پھر سبزہ کروٹیں لیتا ہوا اُٹھے گا درختوں کی ڈالیاں جھومیں گی۔ اور رات بھر کے بعد نورانی صبح طلوع ہو جائے گی۔

آہ پنڈت رتن ناتھ سرشار

اس سے پہلے کہ میں آج ایک پرانی صحبت کا ذکر کروں اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ واقعہ اب سے تیس چالیس برس پہلے کا ہے جب کہ ریاست حیدر آباد مینو سواد میں خلد آشیاں حاتم دوراں میر محبوب علی خاں آصف سادس اعلیٰ مقامہ حکمراں تھے۔ اُس وقت موجودہ تاجدارِ دکن سات قرآن درمیان یعنی ہز اگزالٹیڈ ہائی نس نواب میر عثمان علی خاں بہادر نواب ولی عہد بہادر کے خطاب سے مخاطب کئے جاتے تھے۔

عرش آشیاں نواب میر محبوب علی خاں بہادر کی منظوری سے عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد مستحکم ہو گئی چنانچہ اس چشمہ فیض کی بنیاد پڑتے ہی مبصرین کی کئی کئی انجمنیں کام میں مصروف ہو گئیں۔ گُملائے عصر دور و نزدیک سے طلب ہونے لگے بس یہی وہ زمانہ

تھا جب کہ مولوی شبلی نعمانی اعظم گڑھ سے مولوی عبد الحلیم شرر
لکھنؤ سے پنڈت رتن ناتھ سرشار مولوی وحید الدین سلیم علی گڑھ سے
اور اودھ سے طلب ہوئے غرض مختلف فنون کے نباض یکجا
ہو گئے۔ شعرائے عصر میں مولوی سید علی حیدر صاحب نظم
طبا طبائی جو بعد میں نواب حیدر یار جنگ ہوئے مولانا ضیا یار جنگ
مولانا عبد القادر گرامی ۔ حسامی ۔ رسوا میکش ۔ جناب جلیل جو اب
نواب فصاحت جنگ ہیں مولوی نادر علی برتر اور حبیب صاحب کنتوری
ان سب خوش گو حضرات کے لئے ایک خاص بزم شعر بھی قائم ہوئی جسکے
اجلاس کبھی کبھی دیوان چندو لعل سر گباش کی بارہ دری میں اور کبھی راجہ
رایان بہادر امانت ونت آصف جاہی کے دولت کدے پر جس کے
صدر مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد جیسے قدردانِ علم و فضل قرار
پائے کیونکہ سر مہاراجہ اس وقت بھی وزیر کل فی الکل تھے الغرض
جو بزم دیوان چندو لعل کی بارہ دری میں ہر نیمہ ماہ کو ہوتی تھی
یا کبھی کبھی جس کے غیر معمولی اجلاس ہو جاتے تھے آہ وہ بزم
ادب حقیقت میں عدیم المثال تھی جس میں شرفائے بلدہ کے علاوہ

تمام راجہ مہاراجہ بلکہ کبھی کبھی استادالسلطان نواب فصیح الملک بہادر
داغ دہلوی بھی شرکت فرماتے تھے آمدم برسر مطلب۔ میں اس پرانی
صحبت کی تصویر بھی اپنے ٹوٹے پھوٹے قلم سے کھینچتا ہوں جواب تک
میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اللہ اللہ وہ رات دس گیارہ بجے کا عالم ہلکی ہلکی گرمی کا
موسم وہ بارہ دری کے چوگرد چمن زار کی سرسراہٹ وہ خوشبو میں ڈوبی
ہوئی ہواؤں کا رہ رہ کے آنا وہ بڑے ہال میں مومی اور گیس کے
قمقموں کا چراغاں وہ سفید فرش و فروش وہ شیشہ و آلات کی
جگمگاہٹ ایک حصے میں بلدے کے شریف و وضیع حضرات
دوسرے میں اکثر راجہ مہاراجہ خاص حیدرآبادی لباس میں خوش
وضع شیروانیاں پہنے سنہری روپہلی بکلوس لگائے وہ ان کی دوزانو
مودب نشست تیسرے حصے میں صاحب صدر کے عین سامنے
شعرائے عصر کا پرا مودب اور خاموش مگر خوانندگی کے وقت
جس طرح بلبل چمن زار میں نغمہ سنج۔ خدام زریں کمر دست بستہ ہر
اشارے پر چشم و ابرو کے مطیع۔ آہ آہ اس وقت مشاعرہ گرم تھا
شمع کا نوری ہر خوشگو کے آگے سے ڈھلتی جاتی تھی۔ اور بہت

خوب سبحان اللہ کی خاموشش صدائیں کبھی کبھی زیادہ بلند بھی ہوجاتی
تھیں سچ یہ ہے کہ ہر شخص اس مجلس میں کامیاب ہونے کو اپنے لئے
انتہائے معراج سمجھتا تھا اس آخری مجلس میں مجھے خوب یاد ہے کہ حبیب
صاحب کنتوری مرحوم کے بعد شاہ میکش تھانوی نے اپنا کلام پڑھا
اور خوب پڑھا ان کے بعد ترکی صاحب بہت دیر تک قرات فرماتے
رہے آہ آہ پھر وہ یگانۂ روزگار ہستی شمع افروز ہوئی جس کا نام مولانا
عبدالقادر گرامی تھا۔ گرامی ہائے گرامی۔ حالانکہ یہ قصائد کا جلسہ
تھا اور اکثر قصائد شاہ عرش آشیانی اور نواب ولیعہد بہادر
یعنی موجودہ تاجدار دکن خلد اللہ ملکہٗ کی شان میں بہتر سے بہتر پڑھے
جاچکے تھے مگر گرامی ظالم پھر بھی گرامی تھا اس نے شہزادہ شیخ علی
حزیں کی زمین میں۔ ع سر شوریدہ بر بالینِ آسایش کشید ایں جا۔
دمید ایں جامیں وہ تشبیب کے اشعار پڑھے کہ سننے والے
بے اختیار سر دُھن رہے تھے۔ آہ آہ مجھ بدبخت کو صرف ایک
مصرع یاد ہے۔ رگِ لیلیٰ زدند آغازِ مجنوں خوں چکید اینجا اور
گل اندر گل دمید اینجا۔ افسوس اس کا ہے کہ ان کو آخر عمر میں

ثقل سماعت بہت زیادہ تھا بس اپنی کہتے تھے دوسرے کی نہیں سنتے تھے شدہ شدہ جب گرامی مرحوم پڑھ چکے تھے تو بارہ بج چکے تھے ان کے بعد حُسامی نے دو تین رباعیاں پڑھی تھیں جو رام رنگی کے متوالے ملک کے نامور ادیب پنڈت رتن ناتھ سرشار لڑکھڑاتے ہوئے شمع کے سامنے خود آ بیٹھے اور کہا۔ اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی۔ فی الواقعی وہ ایک بذلہ سنج چہکتے ہوئے بلبل روتوں کو ہنسانے والے تھے ان کے بعد پھر ایک اور صاحب پڑھتے پائے تھے جو سر مدارالمہام بہادر نے مجھ ناچیز کی طرف اشارہ فرمایا ہرچند عذر کیا لیکن مقبول نہ ہوا یہ بھی ایک قصیدے کے شعر تھے جو نواب ولی عہد بہادر کی شان میں اُس وقت عرض کئے تھے اور وہ یہ تھے۔

دو مرقعوں کا نمونہ ہے تری پیشانی
شان محبوب تجلائے خط نورانی

تو نے اردو کو کیا علم و ہنر کا معدن
تو یونیورسٹی عثمانیہ کا ہے بانی

کون سی بات پہ ایمان نہ لائے کوئی
شمع انگشت شہادت ہے کہ ہے لاثانی

ایسی انسانی تدبر کی دکھائیں تو مثال
کہ ہوا چلنے سے پہلے ہی گئی پہچانی

لیکن افسوس صد افسوس اس کے کچھ دیر بعد جب میں اپنی بکواس
ختم کر چکا وہ چہل پہل وہ پُر لطف صحبت یکایک ختم ہو گئی سرکار اور روسا
سوار ہو گئے۔ شعرا صاحبان بھی اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار ہوئے جھٹلے
گاڑیاں گھوڑے اور بڑے بڑے چھپّر سب کے سب اپنی اپنی
سواریوں کو لے کر غائب غلا اب وہ ہی باغ ہو کا میدان تھا ساری
روشنی گل ہو گئی اور بُقعہ نور بارہ دری ایک بھیانک جنگل معلوم
ہوتا تھا فعتبر و یا اولا لابصار جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے پنڈت رتن ناتھ
سرشار جو آج ضرورت سے زیادہ پر کیف تھے وہ آج شہر نہ جا سکے
اور اپنے ایک رفیق سفر شاید منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی کے
ہمراہ اُسی بارہ دری میں شب باش ہونا پڑا یہ دونوں صاحب چونکہ
حضور وزیر صاحب سر مہاراجہ بہادر کے مہمان تھے اس لئے یہاں
بارہ دری میں بھی ان کے لئے ایک خاص کمرہ مخصوص تھا دونوں صاحب
وہیں اپنے اپنے بستروں پر جا لیٹے یہ کمرہ بارہا دیکھا بھالا تھا مگر اس
میں ایک طرف لکڑی کی گھڑونچیوں پر آب دار خانہ تھا جس پر پانی
کے مٹکے گولیں صراحیاں اور گلاس سجے ہوئے تھے اور دوسری طرف

ویسی ہی گھڑونچیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر ڈھلی ہوئی نواڑ کی چکتیاں
تہ بہ تہ ڈھر اوپر چھت تک چُنی ہوئی تھیں۔ اب قسمت کی بات
اس کا کسی کو دھیان بھی نہیں رہا کہ پانی کی گھڑونچیاں کس طرف ہیں
اور نواڑ کی چکتیاں کدھر ہیں اتفاق سے اُسی رات پنڈت جی کو
پیاس کی شدت اور خمار کی تونس نے یکایک چونکا دیا۔ حلق میں کانٹے
پڑے تھے آپ دیوانہ وار بستر سے اٹھ کر پانی کی تلاش میں چلے
اس شدت اضطراب میں اپنی دانست میں یہی سمجھے کہ آب دار خانہ
اوپر ہی ہے۔ آہ آہ مگر وہ موت کا دھوکا تھا قضا اس غریب کو
اُن گھڑونچیوں کی طرف لے گئی جن پر نواڑ چنی ہوئی تھی اور وہ اُسی
گھبراہٹ میں ٹٹولتے ہوئے اُنھیں گھڑونچیوں پر جا چڑھے۔ ستم یہ ہوا کہ
پانی کا وہاں نشان نہ پا کر جو عالم بدحواسی میں ہاتھ پاؤں مارے تو اُن غریب
کا پاؤں پھسل گیا اور وہ اوندھے منہ اس گھڑونچی کے حلقے میں جا گرے
اُن کے گرتے ہی اوپر سے ادھر رکھی ہوئی نواڑ کی چکتیاں دھڑا دھڑ
اُنھیں پر آ پڑیں جس کے صدمے سے ان کی جان نکل گئی۔ آہ آہ
دوسری صبح کو یہ ہولناک خبر مقامی اخباروں میں تھی بس جو پڑھتا تھا سر پکڑ کر رہ جاتا تھا

حضرتِ داغ کی ایک صحبت

رعنا کی ٹوپی

مردم آزار مجالیست خجالت نکشد
کہ نمک آب شود چوں بجراحت گذرد

جب میں نیا نیا حیدر آباد دکن گیا ہوں تو سب سے پہلے سید محمد ہاشم صاحب رعنا دہلوی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ یہ عجیب الخلقت اور جامع الکمال نوجوان میرے مطلب کے نکلے اور رفتہ رفتہ میرے یار شاگرد بن گئے۔ یہ منصب داران حیدر آباد میں سے تھے۔ یہ شخص بلا کا ذہین آسمان کے تارے توڑنے والا مشرق میں پیدا ہو کر مغربی دماغ کا مالک خوش خو خوش پوش، بذلہ سنج بلکہ عجیب الخلقت انسان میں نے تو آج تک رعنا سے بڑھ کر کوئی نہیں دیکھا۔ آہ کاش اس کی تعلیم بھی اچھی ہوتی اور وہ جاہل نہ رہ جاتا۔ مگر افسوس جہاں قدرت

اتنے جوہر دیتی ہے ایک نہ ایک عیب بھی ایسا لگا دیتی ہے جو اُسے عمر بھر کے لیے سوہان روح ہو جاتا ہے۔

عجیب الخلقت میں نے اُن کو اس لیے کہا کہ ان کا جسم آنکھ کان چہرہ مہرہ تو بے شک عام صحیح الجسم انسانوں کا سا تھا۔ ان کا بایاں ہاتھ بالکل نکما تھا۔ اسے لنجا کہیے یا گنہایا ہوا۔ ننھی ننھی بے جان انگلیاں کہو یا رگوں کا بچھا ہر طرح وہ شانے سے لے کر کلائی تک تو ایک آدمی کا ہاتھ تھا مگر ننھی سی ہتیلی اور انگلیاں تو کسی کام ہی کی نہ تھیں۔ یہ بایاں ہاتھ وہ ہمیشہ چھپائے رکھتے تھے بلکہ وہ اس قدر بدنما تھا کہ جس کی نظر پڑ جائے وہ بے اختیار اسے دیکھ کر ہنس پڑتا تھا اور یہ بے چارے دیکھ کر خفیف ہو جاتے تھے لیکن مجھے بھی یہ کد تھی کہ یہ بھلے آدمی اپنی حقیقت کو کیوں چھپاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ جب وہ حسب معمول رستہ چلتے اور آنے جانے والوں کو اپنا داہنا رُخ دکھاتے، لوگوں سے صاحب سلامت کرتے نہایت مسرور تزک و احتشام سے آگے بڑھتے اور میں فوراً ان کو ہاتھ پکڑ کے روک لیتا اور جو صاحب ابھی ابھی ان سے نہایت تپاک سے مل کر آگے جا رہے تھے

انھیں آواز دیتا اور آواز کے ساتھ ہی جوں ہی میری طرف مڑ کر دیکھتے میں رعنا کا فوراً وہی لُنجا ہاتھ جسے وہ اب تک جیب میں چھپائے ہوئے تھے حضرت موسیٰ کے یدِ بیضا کی طرح آگے کر دیتا اور رعنا غریب جل بھُن کر کباب ہو جاتے۔

بارہا ایسا ہوا ہے کہ رعنا صاحب مشاعرے میں بڑے زور شور سے اپنی غزل پڑھ رہے ہیں اور اہل بزم ہیں کہ مارے تعریف کے بچھے جا رہے ہیں جو کہیں بھولے سے انھوں نے وہی کاغذ کا پرچہ اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا بس بجز اس عمل کے وہ کاغذ معاً فرش پر گر پڑتا تھا اور دیکھنے والے قہقہہ لگاتے تھے۔

بایں ہمہ وہ مرحوم بلا کے غزال بھی تھے ان کی ٹکسالی زبان ان کا روزمرہ. ان کی بندش الفاظ یقیناً اس بے سواد ہونے پر بھی الہام کے درجے تک پہنچی ہوئی تھیں۔ اکثر خاص مشاعروں میں انھوں نے انعام لے لئے ہیں اور بڑے بڑے کاملان فن ان کے پڑھتے ہی سر دھننے لگتے تھے۔ سخت افسوس ہے کہ اس جواں مرگ کا سارا کلام نااہلوں کی غفلت سے بالکل ضائع ہو گیا ہے صرف مجھے اس وقت

ایک مطلع یاد ہے اور وہی میں اپنے بیان کی تصدیق میں پیش کرتا ہوں
کدھر ہیں جرعہ چشاں بادہ الفت ذرا انصاف کریں۔

رات بھر پیتے گذر جاتی ہے میخانے میں
اُٹھ کے مُنھ دیکھتا ہوں صبح کو پیمانے میں

بس یہی وہ چیز تھی جس کی بنا، پر میں سید صاحب کی قدر کرتا تھا
یہاں تک کہ مجھ سے اس قدر بے تکلف ہوئے تھے کہ دن رات میرے ہی
گھر ڈھئی دیئے رہتے تھے بارہ بارہ بجے رات کے میں نے انھیں اپنے گھر
سے زبردستی نکالا ہے مگر علی الصباح دیکھتا ہوں تو پھر موجود ہیں آہستہ
آہستہ ٹہل رہے ہیں اور با آواز بلند پڑھتے جا رہے ہیں

کب اٹھے پیر مغاں کب میکدے کا در کھلے

غرض اس محبت کا نتیجہ یہ تھا کہ میں ان کی ہر اچھی بری ضد اٹھاتا تھا
مثلاً ایک تو یہ کہ وہ میری اصلاح شدہ غزلوں کو بغیر میری اجازت
کے ناقدانہ نظر سے دیکھتے تھے بلکہ ان میں اپنی زیادتی سے مین میخ نکالتے
تھے یہ کچھ نہیں بڑا استاد نے یہ مصرعہ تو دست و گریباں ہی نہیں
ہوا ہے، دوسرے ایک بڑا سودا انھیں یہ تھا کہ آپ بھی ہمیں اپنے

استاد کی زیارت نہیں کراتے ہیں۔ کیوں صاحب ہم اعلیٰ حضرت بندگان عالی
کے درباری ہیں کیا حضرت فصیح الملک بہادر ان سے بھی بلند پایہ ہیں
جو آپ ان کا دیدار ہمیں نہیں کراتے ۔ میں ہنستا اور ٹال دیتا۔
در اصل میں ان کی بے تکی حیث و بحث اور دریدہ دہنی سے
بہت ڈرتا تھا مجھے خوف تھا تو یہی کہ یہ شخص اگر وہاں جاکر بھی کچھ بونگا
بے سرا بول اٹھا تو ناحق مجھے بھی رنج ہوگا اور استاد تو ہیں بھی زود رنج
دیکھیے کیا حال ہوتا ہے مگر ہونی شدنی ایک دن یہی حضرت سیر سپاٹے
کی غرض سے مجھے بھی اپنے ساتھ لئے ایک دوست کے گھر جا دھمکے جہاں
ذوق و شوق بھی منایا۔ اور پھر وہاں سے تانگے میں بیٹھ کر بڑے
ساگر پر جا اترے۔ مغرب سے پہلے وہاں سے الٹے پھرے۔ آتے
تھے جو یکایک افضل گنج کا پل سامنے آگیا بس قیامت ہی آگئی رعنا!
بس بس ٹھہرادو جی تانگہ ایک طرف کر لو۔ اے میاں تانگے والے!
سنو سنو ہمیں حضرت داغ صاحب سے ملنے جانا ہے۔ اب بہتیرا
سمجھاتا ہوں بھائی یہ وقت ملاقات کا نہیں ہے
رعنا۔ اجی وقت کیسا؟ آج اتفاق سے قدرت نے ہمیں

ایک ساتھ یہاں پہنچا دیا۔ آج تو میں آپ کے استاد کی زیارت کیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہ جاؤں گا۔ کبھی نہ جاؤں گا چاہے آپ مار ڈالیں سر اتار لیں جناب۔ بس یہی ہو گا اور یہی ہوتا ہے۔

میں۔ دیکھو رعنا دیوانوں کی سی باتیں نہیں کیا کرتے ہیں۔۔ استاد شام کے وقت کسی سے نہیں ملا کرتے۔ ارے بھائی سنو! تو دوسرے یہ ممکن ہے کہ اس وقت وہ خود سیر کو تشریف لے گئے ہوں رعنا معاف کرو اس وقت معاف کرو۔

رعنا۔ معاف کیسا ایک ادھی بھی معاف نہ ہو گی جناب اُستاد نہ ہوں گے تو واپس چلے آئیں گے اتنا کہا اور جھٹ تانگہ سے کود یہ جا وہ جا۔ اُسی ناقابل ہاتھ سے زبردستی چھڑی کو سنبھالا۔ ترکی ٹوپی بغل میں ماری اور لگے پل سے اُترنے۔

چار و ناچار میں بھی تانگے سے اترا اور اس کو ایک طرف پل کے قریب ٹھہرنے کی ہدایت کی اور ان دیوانے سودائی کے پیچھے ہو لیا قریب پہنچ کر میں نے پھر آواز دی او میاں سودائی واپس آؤ جلدی واپس آؤ پہلے ہم سے مشورہ تو کر لو آخر تم وہاں جا کر کہو گے کیا؟

شاید یہ سن کر یا استاد کا بنگلہ دیکھ کر وہ کچھ مرعوب ہوئے اور خود ہی واپس لوٹے پہلے تو مونچھیں سنواریں۔ پھر چہرہ مبارک کا گرد و غبار جھاڑا۔ پھر میرے قریب آن کر فرمانے لگے۔

رعنا۔ دیکھئے جناب۔ اس وقت مجھ جیسا حلیم نہایت غضب میں ہے اور آپ سے اتنی استدعا ہے کہ یا تو مجھے اسی وقت اپنے استاد کے پاس لے چلیں ورنہ۔ ورنہ

میں! تم تو سودائی ہوگئے ہو۔ ورنہ کیا ؟ کیا مجھے مار دوگے۔ مجھے پھانسی دوگے؟

رعنا۔ پھانسی وانسی کچھ نہیں جناب سو کی ایک یہ ہے کہ اگر لے چلنا ہے تو بس اسی وقت لے چلئے۔ چشم ما روشن دل ماشاد۔ ورنہ قدرت نے ہاتھ پاؤں مجھے بھی دیئے ہیں۔ زبان بھی میری تیز چلتی ہے اور وہاں جا کر آپ کی وہ وہ برائیاں کروں گا کہ آپ کو قیامت تک ان کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑے گی سنا آپ نے !

میں۔ جی، بجا ہے یہ تو مجھے آپ سے پہلے ہی توقع تھی۔ سچ ہے۔ ؎

کس نیاموخت علم از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

بس یہ سننا تھا کہ وہ پارے کی طرح قرار نہ لینے والے پھر ایک دفعہ پل کی طرف دوڑے اور جلدی جلدی قدم اٹھاتے اُستاد کی کوٹھی کی طرف چل ہی دیئے۔

اب سخت مجبوری تھی۔ آخر میں بھی ان کی جان کو کوستا ہوا گردن جھکائے گرتا پڑتا انھیں کے پیچھے پیچھے کوٹھی میں داخل ہوا۔ اور ان کو آواز دی۔

رعنا۔ رعنا مجھے دو باتیں تم سے اور کہنی ہیں خبردار بے سُنے نہ جانا۔

شاید اب کچھ پھریری سی کے دم میں تھے جھٹ پلٹ آئے اور فرمانے لگے۔

رعنا۔ جی ارشاد

میں۔ آخر تم نے نہ مانا بہر حال میں نے اپنی حجت تمام کردی اب میں بالکل بری الذمہ ہوں خوب کان کھول کر سن لو یہاں کی فضا ایسی نہیں ہے جیسی کہ آپ نے نہایت گستاخانہ اور بے ادبانہ میری انجمن

کی فضا سمجھ رکھی ہے خدا کے لئے میں آپ کو پھر خبردار کرتا ہوں کہ وہاں جا کر کوئی ایسی ناواجب حرکت نہ کر گذرنا جس سے میں بھی سبک ہوں اور تم بھی۔

رعنؔا۔ توبہ۔ توبہ استغفراللہ کیا آپ مجھے ننھا بچہ سمجھتے ہیں یہ کہہ کر پھر وہ قصداً میرے پیچھے ہو لئے۔ اور میں آگے بڑھا یہاں تک کہ زینہ طے کر کے ہم اوپر جا پہنچے۔ خدا خدا کر کے کشادہ صحن کو طے کیا اور جھپ جھپ اندرونی کمرے کی طرف قدم اٹھا ہی رہا تھا جو اتنے میں خدمت گاروں کے اِشاروں سے پتہ چلا کہ اُستاد آج اپنے کتب خانے کی برابر والی ایک تنگ کوٹھری میں بیٹھے ہیں۔ یا اللہ پہلے ہی کلیجے میں پنکھے لگے ہوئے تھے یہ اور مصیبت آئی جائے تنگ است و مردماں بسیار۔ کیونکہ یہ جاڑے کا موسم تھا اور استاد مرحوم نقرس کے درد کی اکثر شکایات رکھتے تھے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح ساری بدشگونیوں کو دل سے بھلاتا۔ اپنے سودائی شاگرد کے ساتھ اس چھوٹی کوٹھری کے سامنے جا پہنچا۔

قسمت سے یہ تنگ کوٹھری تھی جس میں زیادہ سے زیادہ سات

یا آٹھ آدمی بیٹھ سکتے تھے وہ بھی اُکڑوں آرام سے نہیں اس پر طرہ یہ کہ اُستاد خود ایک لحیم شحیم۔ اس لئے وہ اکیلے فرش پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ اُگالدان اور پیچوان اِدھر اُدھر رکھے تھے۔ استاد کے بالکل سامنے البتہ تھوڑی سی جگہ تھی جس میں ایک چھوٹی سی الماری رکھی تھی اور دوسری طرف دو صاحب حیدرآبادی معززین بڑے بڑے زمرد اور ہیرے طلائی گھڑیوں کی زنجیروں میں لٹکائے ان کے حاشیہ نشین تھے۔ کوٹھری کا دروازہ چشم پاسباں کی طرح کُھلا تو تھا مگر چھوٹا اتنا تھا کہ ایک صحیح و تندرست آدمی کو بغیر سر جُھکائے اس میں سے گزرنا محال تھا۔ دروازے کے اوپر چوکھٹ کے قریب ایک زرد رنگ کی چق بھی لپٹی ہوئی تھی جس سے آنے جانے والوں کا سر اُلجھ جاتا تھا۔ باہر کی طرف کوٹھری سے ملے ہوئے چند اور بزرگوار بھی بیٹھے ہوئے تھے جو استاد کے کلام سے لُطف اندوز ہو رہے تھے مختصر یہ کہ اس نقشے کو لئے ہوئے میں اور بدنصیب رعنؔا آداب حضرت۔ تسلیم قبلہ! کہتے ہوئے زبردستی اُسی کوٹھری میں جا گھسے۔

اُستاد - (چیں بہ ابرو ہو کر) ہیں اس وقت آپ کہاں ؟
میں - قبلہ معافی - معافی - اشتیاق دیدار اس وقت کھینچ لایا
اُستاد - اچھا اچھا بیٹھئے تو - مگر بیٹھتے کہاں ہزار مشکل سے اُستاد
کے قریب ہی دوزانو جگہ نکال لی - اور رعنا سمٹ سمٹا کر ان حیدر آبادی
رُوسا کے ذیل میں جا بیٹھے جہاں وہ چھوٹی الماری رکھی ہوئی تھی -
مگر افسوس صد افسوس اس ناشدنی الماری کی طرف نہ میری نظر گئی
نہ غریب رعنا کی اب جو دیکھتا ہوں تو اس پر تہ بہ تہ جھکڑے بھر
کتابیں اٹا اٹ چُنی ہوئی ہیں بس دم ہی تو فنا ہو گیا کہ بس آج خیر نہیں
آج بُرے پھنسے وہ اپنے ہوش ہی میں نہیں ہے اس پر ایک ہاتھ کا
آدمی خدا خیر ہی کرے جب ذرا سانس قائم ہوا تو خود اُستاد ہی نے
فرمایا - آپ کون صاحب ہیں - آپ کی تعریف ؟ رعنا صاحب اسی طرح
داہنا بازو آگے کئے بیٹھے تھے - قریب ہی تھا کہ وہ کچھ جواب دیں جو
میں نے ان کی نیابت اس طرح کی - یہ میرے ایک دوست ہیں نہایت
ہی بے تکلف دوست ہیں ان کو حیدر آباد ——— ابھی یہ
فقرہ اپنا تمام بھی نہیں کرنے پایا تھا جو رعنا صاحب پٹ سے بول بیٹھے

رعنا - جی نہیں حضور میں آپ کا خیر طلب خادم ہوں آپ کا ادنیٰ ترین شاگرد۔

اُستاد مسکرا کر (میری طرف گوشۂ چشم سے مسکرا کر دیکھتے ہوئے) کیا خوب ہاں بھئی مرثیہ خوان ہونا اپنے بازو کو بھی ہر وقت ساتھ ہی رکھتے ہو ؟

میں - نہیں قبلہ میں بے چارہ کیا مرثیہ پڑھوں گا در اصل یہ صاحب حضور کے دیدار کے بے حد متمنی تھے حُسن اتفاق سے آج ہم ادھر آنکلے انھوں نے اصرار کیا - میں بھی ان کے طفیل زیارت سے سرفراز ہو گیا۔

اُستاد - تو آپ میر صاحب ضرور ہوں گے

رعنا - حضرت قبلہ میر صاحب تو وہ بزرگ ہی تھے جن کے ہم نام لیوا ہیں ہم تو خود غرض لوگ ہیں جی تو بجائی نہیں توڑ کھائی - جناب کے دیدار کا ایک مُدّت سے خواہش مند تھا کیونکہ یہ عاجز بھی اسی سرزمین کا ایک روڑا ہے جہاں کے آپ رہنے والے ہیں۔

اُستاد مُسکرا کر شاباش شاباش اچھا تو آپ بھی ہماری دلی شاہ جہاں آباد کے رہنے والے ہیں - جیؤ بھئی جیؤ - اس وقت حضرت کے طرز

گفتگو میں کسی قدر نرمی آگئی تھی اس لئے میں نے اسی کو غنیمت جان کر رعنا کی طرف رخصت کا اشارہ کیا اور حضرت سے کہا۔

جناب عالی اب میں مرخص ہوتا ہوں اور ایسے ناوقت حاضر ہونے کی دوبارہ معافی۔

اُستاد۔ نہیں بھئی یہ تو تمہارا گھر ہے جب جی ہیں آئے آؤ جاؤ آخر پہلے میں اٹھا اور اُستاد کو سلام کر کے اسی دروازے سے باہر آنے لگا فوراً میرا سر اُسی لپٹی ہوئی چک سے اُلجھا مگر میں سر جھکا کر کسی نہ کسی طرح نکل کھڑا ہوا۔

میرے بعد رعنا اٹھے مگر ان کا اٹھنا تھا کہ بس قیامت ہی آگئی یاد ہوگا کہ وہ بیٹھتے وقت کس طرح ٹھس ٹھسا کر اس الماری سے لگ کر بیٹھے تھے جس پر کتابوں کا انبار تھا اب جو وہ اٹھے تو اپنے ساتھ اس الماری کو بھی لے کر اُٹھے۔ الماری زور سے ہلی، دھڑ سے زمین پر گری۔ رعنا غریب نے گھبرا کر پیچھے دیکھا گرتی ہوئی الماری تو رک گئی مگر وہ کتابوں کا انبار جو اپنی جگہ سے ہٹ چکا تھا وہ اڑا اڑا دھم کر کے فرش پر گرا اور اس کے ساتھ ہی فرش پر سے گرد کا ایک غبار اٹھا جس نے تمام کوٹھری کو تیرہ و

تاریک کردیا۔ بس اب رعنا یہاں قریب قریب بے ہوش تھے اُلٹے پاؤں کوٹھری سے نکلے مگر سر جھکانا بھول گئے اور اُن کی ٹوپی آہ وہی پھندنے والی ٹوپی اسی منحوس جک میں اٹک کر گر پڑی انھوں نے جلدی میں الٹا ہاتھ وہی ننھا ہاتھ ٹوپی پر مارا وہ تو ہاتھ نہ آئی مگر وہی ہاتھ ان امیروں میں سے ایک کی دستار مبارک سے جا مس ہوا جو دو صاحب اُستاد کے بالمقابل اُسی کوٹھری میں بڑے بڑے ہیرے اور زمرد لٹکائے بیٹھے تھے ہائے ہائے ان کی دستار گر پڑی۔ غضب ہوگیا انھوں نے نہایت منغض ہوکر رعنا کی طرف ہاتھ بڑھایا یہ جلدی سے ہٹے ہی تھے جو امیر صاحب کا وہی ہاتھ اپنے ساتھی رئیس اعظم کی دستار پر جا پڑا ساتھ ہی ان کی دستار بھی زمین پر آرہی۔ معاذاللہ۔ پناہ بخدا۔ دونوں امرائے دکن اور تیسرے رعنا صاحب ایک دوسرے کو نہایت غضبناک تیوروں سے دیکھ رہے تھے اور ساتھ ہی اپنی اپنی دستار اور ٹوپیوں کی تلاش میں مصروف تھے۔ سانس چڑھے ہوئے تھے۔ سارے کمرے میں اندھیرا تھا۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف تھا اور کسی کو کسی کی خبر نہ تھی اِدھر استاد کی حالت بھی قابلِ رحم تھی وہ گھبرا گھبرا

کر کہہ رہے تھے ہیں ہیں خیر باشد خیر باشد غرض ایسا مضحک نظارہ اور ہنگامہ خیز واقعہ تھا جس کے تصور سے اب بھی جب خیال آتا ہے تو مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ خدا خدا کر کے رعنا غریب کی ٹوپی اُن کے ہاتھ میں آئی۔ تو وہ پتہ توڑ کر وہاں سے بھاگے ان کے پیچھے میں بدبخت بیٹ پکڑے ہوئے بگٹوٹ دوڑا چلا جاتا تھا آخر دونوں تانگے پر جا کر بے اور صبح تک ہنستے رہے۔

اپنے خالق کو پہچان

یہ جو لمبی لہکاری سخت اور نرم - بلگمی سی چیز حدِّ نگاہ تک بچھی ہوئی ہے - جس پر اونچی نیچی تہیں بھی چو گرد جمی ہوئی ہیں اس کو اس شان سے بغیر کسی سلوٹ اور حرَس کے جس بچھانے والے نے بچھایا ہے - وہی تیرا اور سب کائنات کا خالق ہے - یہ جو تیرے سر پر ایک نیلی سی چادر یا چھتری سی تنی ہوئی ہے - یہ جو لاجوردی سرپوش جو اس فرش پر ڈھکا ہوا ہے - اس کو بغیر کسی ستون اور آڑ کے اس مضبوطی سے قائم کرنے والا ہی تیرا رب ہے - یہ مٹی کا پنجرا جس میں ایک نوری پرند خوش و ناخوش قید ہے - اس پنجرے کے صدہا کل پرزے جس کے حکم سے دن رات کام کر رہے ہیں اور کبھی نہیں تھکتے ان کو بنانے والا اور ایک اسلوب پر سب کو برقرار رکھنے والا ہی تیرا خالق اور تیرا رب ہے - دیکھ دیکھ ذرا غور کر اس نیلی چھت پر یہ جو بڑا سا چراغ بغیر کسی تیل کے دھڑ دھڑ جلتا ہے

جب رات ہوتی ہے تو اس کا بدلہ ایک اور ٹھنڈی روشنی کی گول ٹکیہ سے کر دیا جاتا ہے۔ وہ زریں ٹکیہ ہر روز گھٹتی اور بڑھتی بھی ہے۔ اور ہر مہینہ کے چودھویں دن اُس کا عروج پونم یا بدر کہلاتا ہے۔ اُن کے گرد بے شمار اور ان گنت چھوٹے چھوٹے دئے بھی جلا دئے جاتے ہیں۔ اور پھر اک وقت مقررہ پر یہ طلسمات غائب ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن پھر دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ ان تمام نیرنگیوں کا موجد ہی تیرا خدا ہے تیرا ایشور ہے سمجھ! او نادان سمجھ! تو خود بھی اُسی کے اسرارِ قدرت میں سے ایک بڑا عظیم الشان راز ہے۔

میری بادشاہت کا زمانہ

میں اور میرا دل یا وہ چیز جسے میں کہا جاتا ہے اس دُکھوں بھری مہا فن۔ فریب۔ جلم جلی دنیا کی کشمکش سے بالکل بے خبر ایک نئی نئی جگہ آگر رہے تھے۔ آہ ا۔ میں سمجھتا ہوں گویا میں اس وقت بہت اچھا تھا اور شاید وہ میرے پنگورے میں انگوٹھا چوسنے کا زمانہ تھا۔

مجھے یوں ہی سا دھیان ہے گویا اس وقت میں ایک گل گو تھنا سا بچہ یا گوشت کا لوتھڑا تھا جو نہ اپنے آپ ہل سکتا اور نہ چل سکتا تھا۔ اپنی خواہش کو نہ اپنی زبان سے کہہ سکتا تھا نہ دوسرے کی سن سکتا تھا۔ گرم و سرد خشک و تر میٹھا کڑوا کسیلا۔ سفید و سیاہ۔ اندھیرا اُجالا مجھے کچھ نہیں معلوم۔ مگر ہاں اس محتاجی پر بھی میں گوشت کا ننھا سا لوتھڑا اس وقت سب کا حاکم تھا۔ اور سب کام میری مرضی کے موافق میرے کسی مقررہ اشارے پر آناً فاناً ہوتے چلے جاتے تھے۔ آہ! میں سمجھتا ہوں میں

میں اس وقت بہت اچھا تھا کیونکہ میں معصوم تھا بالکل بے گناہ تھا اور وہ میری معصومیت ہی اس وقت میری بادشاہت تھی۔

ذرا ذرا سی آہٹ پر میں چونک پڑتا تھا۔ لرز جاتا تھا۔ کچھ انجان پتلیاں بالکل ناواقف مورتیں جان نہ پہچان ہستیاں اس وقت خود بخود مجھ پر ہاتھوں چھاؤں کرتی تھیں۔ اور میں فوراً چھاتی سے لگا لیا جاتا تھا یاد ہش بخیر! یہ چھاتی سے لگانے والی مورت جو مجھے اُن سب میں سب سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی تھی آہ! وہی مجسم نیکی ہمہ تن محبت اس وقت میرا بہشت تھا بہشت۔ یا یوں سمجھو کہ میری ننھی سی جان کے لئے گوشت پوست کا ایک محفوظ قلعہ تھا قلعہ جس کی چھاتی سے لگ کر مجھے پھر کسی چیز کی پرواہ نہیں رہتی تھی۔ وہی حد درجے کی مہربان ہستی میری ہر وقت کی نگراں جو آپ گیلے میں سوتی اور مجھے سوکھے میں سلاتی تھی مجھے سب سے زیادہ پیاری تھی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو میں بھی کبھی نہ ہوتا۔ اس کے احسانات کسی طرح بھی مری گردن سے نہیں اتر سکتے۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ میں اس وقت بہت ہی اچھا تھا اور شاید وہی محبت کی دیوی مہاریم آتما مری بہشت نصیب ماں تھی۔ جس سے زیادہ شفیق میں نے

اس سنسار میں کسی کو آج تک نہیں پایا۔ میں بات بات میں بگڑتا تھا روٹھتا تھا۔ ضد یں کرتا تھا اور وہ مقدسہ ساری ساری رات مجھے بہلاتی مجھے پھسلاتی اور اگر ذرا بھی میرا جی بدمزہ ہوتا تو وہ میری دوا دارو میں لگی رہتی اور کبھی بھول کر بھی ایک لفظ زبان پر شکایت کا نہ لاتی افسوس اس احسان کا بدلہ مجھ کافر نعمت کی طرف سے کچھ بھی ادا نہ ہوا۔ اور وہ نعمت مجھ سے اُس وقت چھین لی گئی۔ جب کہ میں اس سے زیادہ سمجھنے کا احساس ہی نہیں رکھتا تھا۔

ہاں مجھے خواب کی طرح یہ خیال بھی آتا ہے کہ اس وقت میرا گرد و پیش مجھے بہت ہی پیارا معلوم ہوتا تھا۔ ہر مورت جس کے پاس میں ہمک کر جاتا مجھے دل کی طرح گود میں لیتی اور چاروں طرف سے پیار ہی پیار برستا دکھائی دیتا تھا بلکہ میرے ذرا سے بے چین ہونے پر گھر کا گھر پریشان ہو جاتا اس وقت میری محسنہ میری انتہائی شفیق کا تو عجب حال ہوتا تھا وہ تو گویا میری دموں دیوانی تھی وہ تڑپ تڑپ کر بھیج بھیج کر مجھے گلے سے لگاتی اپنا منہ میرے منہ پر رکھتی اور جب تک مجھے قرار نہ آتا اُسے بھی چین لینا گناہ تھا وہ بار بار کی بے قراری میرا رونا دھونا تھا

اور وہ دلاسا دینے والی ایکلی شفیق میری انتہائی تسکین۔

اسی عالم میں تھوڑی دیر میں اچانک کسی اندرونی خواہش سے میری آنکھ پھر پٹ سے کھل جاتی ہیں اپنی کمر ور آواز میں کچھ کہتا جیسے وہی میری قدرتی پرستار فوراً سمجھ لیتی تھی ایک نمکین سیال سی گرم چیز میرے منہ سے لگا دی جاتی تھی اور میں مگن ہو کر پھر چسپر چسپر کرتا تھا۔ وہ بے چینی میری بھوک تھی اور وہ بے منت رزق شیر مادر۔

میرا بچھونا میری بسرام کی جگہ ہر وقت ایک دوسرے جسم سے گرم رہتی تھی اس پر بھی میں ہر بے ضرب چونک پڑتا تھا۔ اور اپنے ننھے ہاتھوں سے اس مہربان جسم کو ٹٹول لیتا تھا۔ جس کا کوئی نہ کوئی حصہ میرے اوپر سایہ فگن رہتا تھا۔ اور یہ دیکھ کر میں پھر اپنے آپ کو حفاظت میں سمجھ کر آرام کی نیند میں محو ہو جاتا تھا۔ میرا وہ بار بار چونکنا اس دکھوں بھری جان کا خوف تھا اور وہ نرم سپر میری محسنہ ماں کا ہاتھ تھا جو ہمیشہ میرے آڑے آتا تھا۔

ہر روشن اندھیرے میں مجھے گھر کی انگنائی میں لٹایا جاتا تھا۔ ایک نرم نرم سی چیز سو سو دفعہ مجھے چھیڑتی اور چھو جاتی تھی۔ میرے جھنڈولے

بال اس سے اڑنے لگتے تھے۔ میرے ننھے کرتے کا دامن اس سے کئی کئی بل کھا جاتا اور میں خوش ہو ہو کر آپ ہی آپ مسکرا دیتا۔

آخاہ! اب میں سمجھا۔ وہ روشن اندھیرا۔ وہ چمکیلی تاریکی ضرور گرمیوں کی چاندنی راتیں ہوں گی۔ اور وہ نرم سی بے چین چیز۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کی سرسراہٹ جس سے مردہ دل سے مردہ دل بھی زندہ ہو جاتے ہیں

اُسی عالم میں اس سے تھوڑی ہی دیر بعد عین مرے سر پر، اونچی بہت ہی اونچی ایک چوڑی چکلی نیلی چادر بھی تانی جاتی تھی جس میں آپ ہی آپ میرے مُٹر مُٹر تکتے موتیوں کا ایک بھرا پُرا کھیت بھی اُگنے لگتا یا بہت سے قمقمے روشن ہو جاتے۔ آپ ہی آپ روشنی ہو جاتی۔ بلکہ اسی موتیوں کے کھیت میں ایک اور گول سی سنہری ٹکیہ چمکتی نظر آتی تھی جو میرے ننھے سے دل کو بہت ہی لُبھاتی تھی۔ اس کے دیکھنے سے مجھے آنکھوں سُکھ کلیجے ٹھنڈک پہنچتی۔ بلکہ جب میں اس پر ٹکٹکی ہی باندھ دیتا تو اس میں سے سینکڑوں سونے کے سے تار نکل کر میری گود میں آجاتے جنھیں ہُمک ہُمک کر مُسکرا مسکرا کر پکڑنا چاہتا تھا مگر افسوس! وہ چیز سوائے میرے خوش کرنے کے کبھی میرے ہاتھ نہ آتی ہیں بے فائدہ

کوشش کر کے ہر بار مایوس ہو کر رہ جاتا تھا۔

اللہ اللہ اب میں سمجھا وہ نیلی چادر رات کا دامن ہو گا جو ہر شام کو آسمان پر کھینچا جاتا ہے وہ موتیوں کا کھیت۔ یا چمکتے قمقمے۔ درخشاں ستارے۔ اور وہ گول سی ٹکیہ خدائی چراغ یا پیارا پیارا چاند تھا چاند۔

غلام ہندوستان

سوائے بدنصیب ہندوستان اور ہندوستانیوں کے اور کسی ملک کو غلام بننے کی عادت نہیں۔ آہ جب یہ خیال آتا ہے تو اپنے اوپر آپ نفرین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ سات سمندر پار والے یعنی اہل یورپ تو خدا جانے کس دل و دماغ کے لوگ ہیں کہ برف کے پہاڑوں کو کاٹتے ہیں۔ وقت کو دولت سمجھتے ہیں۔ دن بھر حیرت انگیز محنت کرتے ہیں ماتھے کا پسینہ ایڑی پر ٹپکاتے ہیں۔ اور ضرورتِ زمانہ کے موافق مشینیں۔ ہتیار۔ خورد و نوش کے سامان۔ ادویہ۔ سوئی سے لے کر پھاوڑہ اور رائی سے لے کر پربت تک غیر ولایت سے بنا بنا کر ہندوستان بھیج رہے ہیں۔ معمولی۔ لوہے۔ سیسے۔ پیتل۔ سُوت لکڑی۔ ہڈی۔ سینگ کے بدلے میں ہندوستان کا خون چوس رہے ہیں۔ مٹی بھی اگر بکتی ہے تو یورپ کی مگر یہ بدنصیب ہندوستانی تنو تین

سخت کم ہمت چھوڑے - باوجود گرم مٹی ہونے کے - ایک پن تک نہیں بنا سکتے - کپڑا تک اگر پہنیں گے تو غیر ولایت کا - مرتے وقت کفن تک خریدیں گے تو غیر کا بنا ہوا - کوشش کا خیال آیا تو رانگ اور محنت کا ذکر ہوا اور پگھل گئے - ہاں شیر کس بات میں ہیں - ایف اے - بی اے کر کے ہوٹل کی پتیلیاں مانجھتے ہیں - گریجویٹ ہو کر ریلوے ڈپارٹمنٹ میں کلرک بن جاتے ہیں - امیدواروں میں نام لکھوا کر روز صاحب بہادر کو سلام کرتے ہیں - گھر کا سامان بیچ کر بڑے دن کی ڈالی بنگلہ پر لے جاتے ہیں - ڈیم فول سنتے ہیں - ان کے خلاف شان ہے محنت مزدوری کرنا - کسی پیشہ یا ہنر حاصل کرنے میں بے عزتی سمجھتے ہیں اگر یہ ہتوڑا ہاتھ میں لیکر فٹر کا کام کریں تو ان کا سوٹ بوٹ خراب ہو جاتا ہے - ان کی سات پشت کو بٹہ لگ جاتا ہے - ہاں ان سے غلامی خوب ہو سکتی ہے - ہاں میں ہاں خوب ملانا جانتے ہیں - حضور حضور - غریب پرور غریب پرور کہنے میں ان کی بڑی عزت ہوتی ہے - حاشیہ نشین بن کر نوالے توڑنے میں یہ کتوں سے زیادہ ہمت رکھتے ہیں - کان پر قلم رکھ کر ننگے پاؤں ننگے سر ایک کمرے کی چک اٹھا کر دوسرے

کمرے میں ضرور جا سکتے ہیں۔ دس روپے کی کلرکی کو یہ مسٹر لائڈ جارج کی وزارت کا ہم پلّہ بے شک سمجھتے ہیں۔ اور دوسری قوموں کو ترقی کرتے دیکھ کر بھی ترقی کرنا ان کے مسلک میں سخت گناہ ہے۔

پہلے کی دِلّی

اب سے بہت پہلے اِسی دلّی میں ہندو مسلمان نہایت پیار و اخلاص سے رہا کرتے تھے۔ گو مسلمانوں کی حکومت گئے ہوئے نصف صدی گزر چکی تھی مگر ایک ہوا میں سانس لینے والے ایک ان جل سے زندگی بسر کرنے والوں میں بھائی بھائیوں کی طرح سے میل جول تھا۔ شادی، بیاہ۔ موت، زندگی غرض دنیا کے ہر کام میں وہ ایک دوسرے کے شریک تھے۔ بلکہ ہاٹ بازار۔ رستہ۔ گلی میں جب کوئی ہم محلہ یا پاس پڑوسی ایک دوسرے سے مل جاتا تو صاحب سلامت کے بعد وہیں کھڑے کھڑے کئی منٹ تک ایک دوسرے کی خیر صلا اور خانگی معاملات پوچھتے پوچھتے ہونٹ خشک ہو ہو جاتے تھے۔ مثلاً تمہارے گھر میں خیریت تو ہے؟ بال بچے اچھے ہیں؟ گزارے کی کیا شکل ہے؟ اگر خدا نخواستہ کسی کے ہاں دُکھ بیماری ہو جاتی تو یہ میرا چشم دید واقعہ ہے

بغیر کسی مزدوری یا صلے کے ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے۔ اپنی اپنی معلومات سے فائدہ پہنچاتے اور آڑے وقت میں تو عورت۔ مرد۔ بوڑھے نوجوان سب کے سب سگے بھائی بہنوں کی طرح ایک دوسرے پر ہاتھوں چھاؤں کرنے لگتے۔ چھوٹے کی چھٹائی، اور بڑوں کی بڑائی کا اُس زمانے میں خاص امتیاز تھا۔ آپس میں لین دین۔ بنج بیوپار۔ اس عام محبت اور بے فکری کے ساتھ ہوتا کہ اُس وقت میں اور آج کی دنیا میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

بلامبالغہ ایک روپئے کے ۳۰ سیر گیہوں۔ من بھر کے چنے۔ خالص تین سیر کا گھی، جواب قیامت تک نہیں مِل سکتا، کھُلے بندوں بِکتا تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ ایک روپئے کا آٹا دو میاں بیوی ایک مہینے تک خوب اللے تللے سے کھا کر بھی تمام نہیں کر سکتے تھے۔ دوُدھ۔ دہی۔ مکھن ایسا خالص کہ جنہوں نے کھایا ہے بس وہی خوب جانتے ہیں۔ تیل، لکڑی افراط کے ساتھ ملتے تھے۔ ساگ پات اور ترکاری تو کوڑیوں کے مول بکتی تھی۔ جس کا جی چاہے الغاردں لے لے کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا۔ غریب غُربا نہیں امیر لوگ کھاتے پیتے آدمی ایک پیسے میں چار سودے لینے کے عادی

اس پر بھی ملک میں کسی قسم کی بے چینی، پریشانی یا عام گھبراہٹ کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ جسے دیکھو، ہندو مسلمان، عیسائی، یہودی، پارسی، سکھ اس سرے سے اُس سرے تک ہنسی خوشی اور اَمی جمی سے زندگی بسر کرتے تھے۔

دلّی! ہائے وہ پچاس برس پہلے کی دلّی بس کیا کہوں؟ شہر کیا تھا ایک گلزار تھا گلزار۔ فتح پوری سے لے کر چاندنی چوک، گھنٹہ گھر، فوارہ اور پھر خونی دروازے سے اُدھر لال قلعہ تک شام کے وقت اگر تھالی پھینکو تو سروں ہی سروں پر چلی جائے۔ دوسری طرف نیا بانس۔ لال کنواں حوض قاضی اور پھر چاوڑی بازار سے جامع مسجد تک ایک عام تفریح گاہ تھی کہ شہر کے امیر و غریب روزانہ بنے سنورے۔ کچھ پیدل کچھ اپنی اپنی سواریوں میں گل گشت کرتے نظر آتے تھے۔ تیس ہزاری کی طرف ٹھیک دوپہر کو جہاں اب لارڈ ڈفرن کا پُل ہے بلکہ اس سے ذرا آگے جہاں نہرِ سعادت خاں لہریں لیتی تھی گرمی کے موسم میں یہ غریبوں کے لئے ایک جنت کا ٹکڑا تھا جس کے دونوں کناروں پر صدہا سایہ دار درختوں کا جھرمٹ تھا۔ شوقین تیراک پُل پر سے کودتے تھے۔ قسم قسم کی تیرائیاں

دکھاتے تھے۔ شیخو والے۔ نہروں والے، اور خدا جانے کون کون والوں میں مقابلہ ہوتا تھا اور خلقِ خدا، سب سے زیادہ کارخانہ دار لوگ بہرہ اندوز ہوتے تھے۔

دو طرفہ سودا سُلف بیچنے والوں کے خوانچے۔ پھول والوں کے سیدِ گُل۔ لال لُنگیاں باندھے سقّوں کے کٹوروں کی جھنکار ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھی۔ جا بجا مسلمانوں اور ہندوؤں کی سبیلیں، پاؤ جن سے عام مخلوق سیراب ہوتی تھی اور کوئی کسی سے دوسر اہٹ جاتا بھی نہ تھا۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، چاوڑی بازار تو ہر شام کو سچ مچ کا شاہی بازار بن جاتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اُس مغلیہ بازار میں خرید و فروخت کرنے والی سب کی سب عورتیں ہوتی تھیں اور یہاں سب مرد۔ شوقین جیوڑے اکثر وجیہہ و شریف، کچھ اہلِ حرفہ بقدرِ مقدرت اچھے اچھے لباس پہنے بنے سنورے نکلا کرتے تھے۔ کوئی بادپا پر سوار ہے۔ کوئی فٹن خود ہانک رہا ہے۔ عطروں میں بسے پھولوں کے آڑے گنٹھے پہنے اِدھر اُدھر گز رجاتے تھے۔ کہیں نفیری بج رہی ہے۔ کہیں خوش گلو باجے پر گا رہے ہیں۔ کہیں چوک میں حقے والے ساقی حقے لئے کھڑے ہیں غریب

غربا چلتے چلتے ٹھہر جاتے، دو کش لگاتے اور پیسہ دو پیسے ہاتھ پر دھر یہ جا وہ جا۔ مگر آج وہی دلی ہے، وہی شہر۔ مگر وہ حالت نہیں نکبت ادبار اور عام افلاس نے خلق خدا کی صورتیں تک بگاڑ دی ہیں نہ تن پر کپڑا نہ پیٹ کو ٹکڑا۔ نوجوانوں کی لعل سی جانیں خودکشی کی نذر ہوتی ہیں۔ روزگار نایاب۔ علم و ہنر گو پہلے سے چہار چند ہے اس پر بھی فراغت اور اطمینان قلب نایاب۔ حالانکہ ملک میں ذرائع آمدنی پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ زراعت اور غلہ کی پیداوار دگنی چوگنی ہوگئی ہے خام چیزوں کی مانگ بہت زیادہ۔ آب پاشی کی کثرت۔ لیکن اس پر بھی جہاں دیکھو خاک اُڑ رہی ہے اور نانِ شبینہ کو محتاج ہیں۔

جمنا کے کنارے

اب میں پچاس برس پہلے کی ایک رنگیلی صحبت کا ذکر کرتا ہوں۔ جس سے صاف معلوم ہو جائے گا وہ کیسا اَمی جمی اور بیفکری کا زمانہ تھا۔ آہ! یادش بخیر وہ برسات کا موسم۔ ساون بھادوں کی گھٹائیں دن رات جھوم جھوم کر برستی تھیں۔ کبھی ابر محیطِ آسمان رہتا کبھی رنگا رنگ بادل اجلے گیلے پھرنے لگتے۔ کئی کئی شوخ و شنگ ہمجولی مختلف رنگ کے لباس پہنے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے محوِ گلگشت ہیں۔ شُدہ شُدہ کبھی پھر یکایک ایسی اندھیری چھا جاتی کہ بلا مبالغہ دن پر اچھی خاصی رات کا دھوکا ہو ہو جاتا۔ غرض اسی تاریکی میں پھر جو بجلی چمکتی تو سفید براق بگلوں کی لمبی قطار آسمان پر ایسی بھلی معلوم ہوتی تھی جیسے گوری کی آنکھوں میں کاجل۔

بس اِسی عالم میں اکثر شوقین جیوڑے سیلانی پنچھی گویا اس شعر کا اعادہ کرتے گھروں سے نکل پڑتے ہے

کبھی ساون کی جھڑی ہو کبھی بھادوں برسے
ایسا برسے مرے اللہ کہ چھاجوں برسے

ابھی برسا ابھی پھر کھُل گیا۔ ابھی پھر دھواں دھار برسنے لگا۔ وہ بجلی کا رہ رہ کر کوندنا۔ وہ بادل کی گرج اور گرج کے ساتھ ہی بار بار وہ موروں کا جھنگارنا، کوئل کی کوک پپیہے کی الاپ، ان چیزوں کو کچھ انھیں دلوں سے پوچھئے جو قدرت کے کرشموں کے دالہ وشیدا ہیں یا ازلی لٹے ہوئے لوگ۔

الغرض اب سے پچاس برس پہلے بالکل ایسا ہی اک فرحت افزا دن تھا جبکہ برسات کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ع سرود بستاں یاد دہایندن۔ کے موافق چند حسین حسین صورتوں کو لال سبز پٹڑیوں پر ساون کا جھولا جھولنے اور ملار گانے کے لئے دریائے جمنا کے کنارے ٹوٹے کنوئیں تک کھینچ لائی تھیں جس کو آج تک دلی والے نگمبود دروازہ یا نگاہ موت کے نام سے پکارتے ہیں۔

یہ پارٹی کی پارٹی عورتیں اور مرد شکرم گاڑیوں میں لدے پھندے آموں کے ٹوکرے۔ جامنوں کے چھبیے، فرش فروش اور سامان خورد و نوش لئے لبِ سڑک آ اُترے۔ گاڑیوں کو تو وہیں چھوڑا، پھر سب کے سب ہنستے کھیلتے پاس ہی ایک آم کے تختے میں آ براجے۔ یہاں آتے ہی دم کے دم میں ڈیرے ڈنڈے ڈال دئے، فرش بچھ گئے کڑاہیاں چڑھ گئیں۔ آم اور جامنوں کے ڈھیر لگا دئے۔ اوّل اوّل دسترخوان بچھے۔ سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر سب نے ہاتھ منہ دھو، پانوں کی گلوریاں رچا۔ ایک ایک جوڑی باری باری سے جھولنے لگی اس وقت ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی۔ جو یکا یک سامنے سے ایک حسین ترین جوان ململ گیری رنگ کا نیچا کرتہ پہنے، شہزادوں کی سی اونچی سلمے کی سر پر، دلّی کی سپاٹ سلیم شاہی پاؤں میں، جوانی کے نشے میں جھومتا جھامتا ادھر ہی آتا دکھائی دیا۔ بس اسے دیکھنا تھا کہ وہ سب کی سب حسین صورتیں مارے خوشی کے پھول کی طرح کھِل گئیں بلکہ کھلکھلاتی ہنستی دوڑی ہوئی اُس کے خیر مقدم کو گئیں

وہ آئے وہ آئے صاحبِ عالم، بس اب ہماری سیر پوری سہاگن ہوگئی
یہ لفظ گویا ہر ایک کے ترجمانِ دل تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں
وہ حسین جوان بھی خوش خوش وہیں آ بیٹھا۔ پہلے تو اپنے میزبانوں
کی خاطر سے کچھ منہ جھٹلا، اور پھر باری باری سے ہر ایک کے ساتھ
جھولا جھولنے لگا۔ چنانچہ اسی طرح باری باری سے ہر جوڑی پاؤں
جوڑ کر جھولتی اور باقی سب کے سب کھڑے ہو کر جھونٹے دیتے
تھے اور زبان سے کہتے جاتے۔ "آئے بدروا کارے کارے"
بیشک ان میں سے کئی خوش گلو تھے۔ انھوں نے اس ملار کو
اس خوبی سے گایا کہ ایک سماں بندھ گیا۔ طرہ یہ کہ اس پر ہر اچھی
صورت نے اداکاریاں بھی کیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ جب اُس جوان
رعنا کی باری آئی تو وہ ظالم کچھ اس بلا کا خوش گلو تھا کہ اس نے ان
بولوں کو "آئے بدروا کارے کارے۔ کارے کارے۔ آئے
بدروا کارے کارے" بغیر کسی اداکاری کے کچھ اس طرح گایا کہ
سب پر اک عالم وجد طاری ہوگیا۔ بلکہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا
گانا بھی ایک سحر ہے جادو ہے۔ واقعی نعمت ہے خاص جس کو وہ خالق عطا کرے

عبرتناک مشاہدہ

بنانے والے نے خون چربی۔ بلغم۔ بال۔ ناخن۔ گوشت پوست اور ہڈی سے کیسی کیسی پری وش صورتیں بنائیں اور پھر آپ انھیں مٹا بھی دیا۔ جس حکمت کاملہ سے ان کے بنانے میں سہولیت کا پہلو اختیار کیا اسی نے ایسی حیرت ناک جلدی سے انھیں مٹا دیا کہ سب کے سب منھ دیکھتے رہ گئے۔ اپنے بھید اس لازوال قوت نے اپنے ہی تک رکھے اور اپنے کام اپنے ہاتھ کے سوا دوسرے کی طاقت سے باہر جیتی جاگتی مورتیں۔ چلتے پھرتے پتلے۔ ڈھلتی پھرتی چھاؤں۔ گھٹتے بڑھتے دن رات تو بجائے خود اس کی معرفت اور قادر یکتا ہونے کے نمونے ہیں ہی مگر مرمٹنے کے بعد خاک ہو جانے پر بھی جو کسی مرنے والے کا کہیں کوئی

نشان مل جاتا ہے۔ وہ بھی اس کی قدرت۔ اس کی شان اس کی بے نیازی اور استغنا کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور عبرت کی مجسم تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اُف رستے چلتے میری نظر ایک اونچی جگہ جا پڑی۔ جہاں اک چھوٹے سے مکان کے پچھواڑے تین کاسہ سر گوڑی پر پڑے ہوئے تھے پہلے تو ذرا یقین نہ آیا کہ اس طرح علیٰ اور ایسے موقع پر جو یوں سر راہ ہو آدمیوں کی کھوپریاں ہوں گی مگر نہیں تامل اور غور نے تھوڑی سی دیر میں فیصلہ کر دیا کہ بے شک جو کچھ میرا خیال تھا سچ مچ وہی ہے، یقین کے بعد میرے قدم وہاں سے نہ بڑھے میں نے رومال منھ پر رکھ لیا اور اونچائی چڑھ کر بالکل اُن کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اب میں کیا بتاؤں میں نے کیا دیکھا۔ وہ کھوپریاں زرد ہو گئیں تھیں۔ اُن پر چمڑے کا کہیں نام بھی نہیں تھا۔ وہ گویا ہڈیوں کے خول تھے جن میں آنکھوں کے گڑھے کانوں کے سوراخ جبڑوں کے نشان ناک کا بانسہ اور دانتوں کی جڑیں کم و بیش باقی تھیں۔ مجھے صُمٌّ بُکمٌ کھڑا دیکھ کر اور بھی راہ گیر وہاں ذرا کی ذرا

ٹھٹکے - ایک نظر اس منظر کو بھی دیکھا مگر کچھ تو دیکھتے دیکھتے آگے بڑھ گئے کچھ منھ پھیر کر آنا کانی دے نکلے - دو ایک ناسمجھ مسکرائے اور چلدئے مگر ایک شخص نے باواز بلند کہا - یہ آدمی کی کھوپریاں یہاں لاکر کس نے ڈال دیں - انھیں تو کہیں اور پھینکا ہوتا -

آہ! آہ! موجودہ حالت اور ان آخری الفاظ کا اثر جو کچھ اس وقت میرے دل پر ہوا وہ لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا - قبرستان میں نہیں - کسی کھیت میں نہیں جنگل میں نہیں کسی کنویں میں نہیں - کھائی میں نہیں - ہیں تو کہاں گوڑی پر اس پر بھی نہیں کہیں اور پھینکا ہوتا افسوس! صد افسوس - گو کہنے والے کا مقصد ان الفاظ سے قبرستان ہی کیوں نہ ہو اور مجھے بھی ظن المومنین خیرا کے لحاظ سے یہی سمجھنا چاہیئے مگر نہیں اس وقت خود ان الفاظ نے اور قائل کے نفرت بھرے لہجے نے یہ معنی ہر گز نہیں ظاہر کئے اور میں آسمان و زمین اور اس مقام اور ان کاسہ سر کو ضرور رہ رہ کر دیکھنے لگا - ان میں کسی قسم کی حس نہیں تھی کسی جوش کا نام نہیں تھا سوا نے اس کے ایک بے کسی نفرت زدہ صورت میں زبان حال سے

کہہ رہی تھی کہ ادھر نہ دیکھو - ادھر نہیں دیکھا جائے گا۔ کاش میں
علم اعضائے انسان جانتا ہوتا اور یہ تمیز کر سکتا کہ ان تینوں
سروں میں کون سا کس مرتبے کا ہے کون عورت ہے اور کون
مرد ہے - آخر دیکھتے دیکھتے ان میں سے دو کو تو میں نے اُس
نجس اور کثیف جگہ سے اٹھا کر ایک طرف برابر برابر گردن کے
بل رکھ دیا۔ مگر تیسرے سر کے اٹھانے کی مجھ میں جرأت نہ ہوئی
کیونکہ وہ ایک تو اُن سے زیادہ شکستہ تھا اور دوسرے تھا
کچھ ایسی حالت میں کہ مجھ کمبخت سے نہ اٹھ سکا - ان دونوں میں
ایک کا ماتھا کسی قدر چھوٹا اور تنگ تھا - دوسرے کا بہت اونچا
کشادہ تھا۔ جس کا ماتھا اونچا تھا اس کی ناک کا بانسہ بھی ستواں اور
نازک تھا۔ سر بھی دوسرے سے جس کی گدی کی ہڈی ایک جگہ سے
غیر معمولی اونچی تھی مدوّر معلوم ہوتا تھا۔ کیا عجب ہے جو یہ مرنے والا
پہلے سے زیادہ حسین ہو دُنیوی ثروت میں بھی اس سے زیادہ ہو۔
کچھ ہو نہ ہو۔ غرض تقدیر میں تو ضرور ایک دوسرے کی تفریق
ہوگی مگر اس وقت دونوں کی حالت یکساں تھی مگر یہ ممکن نہیں کہ

دنیا میں بھی دونوں نے ایک ہی حالت میں بسر کی ہو لیکن یہ ہیں کون ؟ مسلمان ہیں کہ ہندو ؟ عیسائی ہیں کہ یہودی کوئی نہ کوئی مذہب تو ضرور ہوگا۔ آہ ! مگر اس وقت تو کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکتا۔ ان میں حاکم ومحکوم کا مرتبہ تو نہیں ہے۔ ہو بھی تو کیا عجب ہے ؟ لیکن اس وقت تو دونوں برابر ہیں۔ برابر کیا معنی ؟ بالکل ایک جگہ۔ ایک مقام پر ایک حال میں پھر کیوں کر معلوم ہو کہ یہ کون ہیں میں ان سے پوچھوں ؟ یہ بولیں گے ؟ نہیں نہیں یہ بیچارے کیا بولیں گے۔ اور اگر کچھ کہیں بھی تو میں ان کی زبان کیا سمجھ سکتا ہوں نہ سمجھنے کی وجہ ؟ وجہ یہ کہ میں دوسرے عالم میں ہوں یہ دوسرے عالم میں میں بقید حیات ہوں۔ میرا خاکی پُتلا قدرت کے نور سے ابھی تک روشن ہے اور یہ بیچارے ...... دونوں اپنا اپنا وقت ختم کر چکے ان کا نور لطیف واپس بلا لیا گیا۔ ان کی خاک خاک میں مل گئی۔ اور یہ جو کچھ ہیں بس نہ ہونے کی طرح۔ آپ ہی آپ یہ سوال جواب کرتے کرتے اور اُن بے جان کھوپریوں کی طرف ٹکٹکی باندھے ایکا ایکی مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ مرنے والے زندہ ہو گئے

اور اپنے بغیر ڈھیلے والی آنکھوں سے برابر مجھے گھور رہیں ہیں۔ وہ نگاہیں جو ظاہرہ کسی کو نہیں دکھائی دیتی تھیں۔ بے تحاشا میرے دل میں۔ میرے کلیجے میں اترتی چلی جاتی تھیں اور میں حق حیران کھڑا تھا کہ الٰہی اب کیا ہو گا۔ ان ہونٹوں میں زبان نہیں تھی۔ ان پر گوشت پوست کچھ نہیں تھا لیکن بے تکلف میرے کانوں میں یہ آواز چلی آتی تھی۔ او دیکھنے والے کبھی اِن آنکھوں میں بھی جادو تھا۔ یہ آنکھیں بھی خوبصورت تھیں مگر اب کچھ نہیں دکھائی دیتا بلکہ ہم خود اُن آنکھوں کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کہ وہ کہاں گئیں۔ یہ کان بھی سخن آشنا تھے کبھی انھوں نے بھی پیار کی باتیں اتنی سنی ہیں کہ آخر بہرے ہو گئے اِسی صورت کو لوگ دیکھا کرتے تھے مگر اب دیکھا نہیں جاتا اِنھیں دانتوں نے جن کا اب نشان ہی نشان باقی ہے وہ لذیذ غذائیں چبائیں اور کھائی ہیں کہ زبان خیال آج تک نہیں بھولتی۔ اے شخص ہمارے بھی ہاتھ پاؤں تھے۔ کبھی ہم بھی چلتے پھرتے تھے مگر اب اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے۔ دوسرے کے محتاج ہیں۔ خواہ ٹھوکر مار کے پھینک دے خواہ ہاتھ سے اٹھا کر کہیں رکھ دے او!

عارضی نازک دماغ یہ دماغ اچھا نہیں۔ ناک پر سے رومال اٹھا لے کبھی ہم بھی ایسے تھے کہ عطر کی آمیزش ہمیں الگ معلوم ہوجاتی تھی۔ حنا کی تیزی ناگوار۔ چنپا کی شوخی سے دماغ پریشان۔ گلاب سے نزلے کی تحریک کا خوف رہتا تھا۔ اور پھولوں کی پھنکھڑیاں کروٹوں میں دب دب کر پنڈے میں نشان ڈال دیا کرتی تھیں لیکن آج وہی ہم ہیں کہ کُوڑی اور مُزبلہ ہمارا مسکن ہے خس و خاشاک ہماری زینت۔ اور خاک نے ہمارا پردہ ڈھانکنا بھی گوارہ نہ کیا۔ او جوان اپنی صورت پر نہ اترا۔ ان اُجلے کپڑوں کو یہاں کی آلائش سے نہ بچا۔ تو ہی دنیا سے عنقا نہیں۔ ہمارا لباس بھی وہ لباس تھا جس کی ذرا سی شکن درزی کی جان کا وبال اور ہماری بے چینیوں کا پورا ذریعہ ہوجاتی تھی۔ آج وہی ہم ہیں کہ ہمارے مغرور سر ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ اور ہماری چٹکی بھر خاک کہیں ٹھکانے سے نہیں ؎

لحد میں اُن کے جسمِ نازنیں پر کیا گذرتی ہے
سحر تک جن کو بے چینی رہی ہو چینِ بستر کی

اے بھائی ہم پر ہنسنا اپنی حالت پر رونا ہے۔ دنیا میں کسی کو گھڑی بھر چین نہیں۔ یہاں خوشی کا نام بڑی مشکل سے آتا ہے زرین لباس صرف دیکھنے ہی کے ہیں یہاں جواہر پوشش مرصع اور قاقم وسنجاب پہننے والوں کے پہلوؤں میں وہ وہ دکھے ہوئے دل موجود ہیں جو ایک غریب آدمی بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا اے بھائی! یہاں جو روتا ہے وہ تو روتا ہی ہے مگر جو ہنستا ہے وہ بھی روتا ہی ہے۔ غرور ذلت کی دلیل ہے۔ بڑے بول کا سر نیچا ہے۔ ان لفظوں کو ہرگز بے معنی نہ سمجھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو یہ سودا سر میں سمائے اور پھر کوئی ٹھوکر بھی نہ مارے ؎

کیا کسی کی ہستیاں ہیں تاج ہو یا دلق ہو
کاسۂ فغفور دیکھا ٹھوکریں کھاتے ہوئے

اے بھائی! جسمانی قوت۔ روحانی طاقت۔ چند روزہ تحکم یا اس آنے جانے والی جوانی پر بھول کر بھی نہ جانا بڑے بڑے سورما بڑے بڑے صاحب اثر۔ بڑے بڑے کڑیل جوان مائی کے لال منوں مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ آسمان نے انھیں ایسا

پیسا کہ سانس لینے کی بھی مہلت نہ ملی ۔ ؎

ہزاروں لالہ رُو ہیں دفن اِس میں
بھَری ہے گود پھولوں سے زمین کی

یہاں دانائی کا دعویٰ محض نادانی ہے ۔ اور زباں دانی محض بے زبانی ۔ اے شخص ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دُور کیوں جایئے ہمیں کو دیکھ لے ہم ایک زمانہ دیکھ چکے ہیں ۔ عمر بھر خاک اُڑائی ہے ۔ اس دنیائے فانی میں کس کس طرح نہیں بسر کر چکے ۔ اپنے وقت میں کیا کچھ نہیں جانتے ہوں گے لیکن اس وقت ہم تجھے یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ہم کون ہیں ۔ کہاں مرے کہاں دفن ہوئے ہڈیاں کہاں پھنکیں ۔ اور خاک نامراد کہاں کہاں برباد ہے بھائی دنیا بالکل سایۂ پرِ کبوتر ہے ۔ یہاں کی زندگی بس اتنے ہی سانسوں کا شمار ہے جو ہنسی خوشی گزر جائیں نتیجہ سے پہلے کبھی کسی کو خوش نصیب نہ سمجھنا ۔ ٹھہر ۔ ٹھہر تیری آنکھوں میں ابھی سے کیوں آنسو بھر آئے ۔

فیروز شاہ کی لاٹھ

اس لاٹھ کے متعلق ضیاء الدین برنی کی نئی تحقیقات یہ ہیں کہ اس مینار کو راجہ اشوک نامی ایک ہندو راجہ نے موضع جگادھری ضلع انبالہ میں اول اول نصب کیا تھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے ۱۳۵۰ء میں اب سے چھ سو ۶۰۰ برس قبل اس مینار کو وہاں سے اُکھڑوایا اور دِلّی شاہ جہان آباد میں پرانے قلعے کے پاس اپنے محل میں پورے سو میل دُور لاکر پھر نصب کرا دیا۔ چنانچہ دیکھنے والے اسے دِلّی دروازہ کے باہر کوٹلہ فیروز شاہ میں اب بھی جوں کا توں دیکھ سکتے ہیں۔

اس لاٹھ کی کل اونچائی چھیانوے ۹۶ فٹ بیان کی جاتی ہے جس میں سے چوبیس فٹ اُن چھ درجوں میں چھپی ہوئی ہے جو بنیاد و ل یا اڑواڑوں کے طور پر اس کے گرد بنا دئے گئے ہیں۔ اس پر بھی

باہر جتنی نکلی ہوئی ہے اس کی لمبائی بہتر فٹ ہے۔ اس پتھر کی لاٹھ کو اتنا صاف کیا گیا ہے کہ سورج کی روشنی میں شیشہ کی مانند چمکتی ہے

مسلمان بادشاہوں کے جاہ وجلال انھیں آثار قدیمہ سے اب بھی صاف ظاہر ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت کا تو یہ مقام ہے کہ اُس زمانے میں نہ کرین تھی۔ نہ عمل جرثقیل کے متعلق کوئی سامان تھا نہ بار برداری اور نہ ڈُھلائی کے کوئی تسلی بخش اسباب تھے۔ اس پر بھی یہ ہزاروں من کا بوجھ سینکڑوں میل دور کس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل کر دیا گیا۔ اور پھر وہ کون سی قوت تھی جس نے اتنے بڑے عظیم الشان مینار کو بغیر کسی صدمے کے تنکے کی طرح اٹھا کر یوں تیر کی طرح سیدھا کھڑا کر دیا۔ اور پھر وہ اس مضبوطی کے ساتھ نصب ہوا۔ کہ اب تک چھ سو برس گزرنے پر بھی اسے جنبش نہیں۔ کہتے ہیں سلطان کو اس مینار کے دیکھتے ہی ایسا شوق ہوا کہ اُس نے فوراً اُسے اپنے پہلے مقام سے اکھڑوا کر اپنے قلعے کے پاس نصب کر دینے کا حکم دے دیا۔ بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ اگر میں فوت ہو جاؤں تو مجھے اس کے قریب ہی دفن بھی کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں

کوئی سامان نہ تھا۔ نہ ریل نہ تار۔ نہ بار برداری کے سامان نہ کھودنے اور نصب کرنے کے ہتھیار نہ اوزار۔ اور مسالے۔ بس صرف ایک شاہی حکم تھا۔ جس نے شاہی زبان پر جاری ہوتے ہی تکمیل کے تمام درجے طے کر دئیے۔ ہزارہا سوار اور پیادے ایک دم لوہا لاٹھ سے لپٹ گئے۔ بڑے بڑے سنبھل اور کُدالیں چلنے لگیں۔ اور بُنیادیں کھود کھود کر مینار کو زمین سے نکالنے کا قطعی ارادہ کر لیا گیا مینار کو چوٹ پھینٹ سے بچانے کے لئے سینکڑوں سیمل کی روئی کے گٹھے مینار کے گرد چُن دئے گئے۔ اس طرح جب یہ لاٹھ بنیادوں سے نکل کر ایک دم گر پڑی۔ تو اُنھیں گٹھوں کے اوپر گری۔ اور اُسے ذرہ برابر نقصان یا کھریچ نہ آئی۔ پھر اسے پیندے سے لے کر چوٹی تک روئی۔ چمڑے اور گھاس پھونس میں لپیٹ کر اس پر ٹاٹ چڑھا دیا گیا۔ اس طرح جب وہ ایک بڑا پلندہ سا بن گیا تو موٹے موٹے سُوت کے رسّوں سے کس دیا۔ تاکہ ڈُھلائی کی کشمکس میں اُسے کوئی آزار نہ پہنچے۔ پھر بڑھیوں کی ایک فوج کی فوج درخت کاٹ کاٹ کر ایک بڑا چھکڑا بنانے پر پل پڑی۔ جس کے بیالیس پہیے

تھے۔ چھکڑا یا گاڑی بن جانے کے بعد پھر پہیے میں ایک ایک موٹا سوت کا رسّا باندھا گیا اور ہزاروں آدمیوں نے چوٹی سے ایڑی تک کا زور لگا کر اس لوہا لاٹھ کو اس چھکڑے پر چڑھا لیا۔ پھر انھیں رسّوں کو جو پہیوں میں بندھے ہوئے تھے۔ دو سو تین سو آدمی کھینچتے ہوئے گاڑی جمنا کی طرف لے چلے۔ خدا خدا کر کے یہ پہاڑ دریا تک پہنچا وہاں خود سلطان فیروز شاہ مع اراکین سلطنت اس کے استقبال کو کھڑا تھا۔ چھکڑے کے وہاں پہنچتے ہی اس نے فوراً ایک بڑا بیڑا بھاری کشتیوں سے تیاری کا حکم دیا۔ جن میں سے ایک ایک پانچ سے لے کر سات ہزار من بوجھ لے جانے والی تھی۔ بہت سی کشتیوں کا بیڑا جب تیار ہو گیا۔ تو سینکڑوں ہزاروں انسانوں کے چھاتی کے زور سے یہ لوہا لاٹھ مع چھکڑے کے اس بیڑے پر بار کی گئی اور بیڑا پانی کی تیز دھار میں چھوڑ دیا گیا جو سو میل سے زیادہ فاصلہ طے کر کے رفتہ رفتہ عین شاہی قلعے کے نیچے دِلّی شاہجہان آباد میں جا لگا۔ وہاں ایک دم ایک بڑی جماعت چابکدست معماروں اور مزدوروں کی موجود تھی۔ جو بلا

کی طرح لپٹ گئی۔ اس نے پہلے تو ایک درجہ عمارت کا بنایا۔ اس پر مینار کو چڑھا دیا۔ پھر دوسرا تیسرا۔ چوتھا۔ اس طرح چھ درجے تک عمارت بلند کی گئی۔ جب وہ اس بلندی پر پہنچی جتنی سلطان کو منظور تھی۔ تو اب اس مینار کو سیدھا کھڑا کر کے نصب کرنا شروع کر دیا۔ اور یہی وہ سب سے بڑی مشکل بات تھی جو عقلوں کو حیران کرنے والی تھی۔ یہاں تک کہ یہ لاٹھ بجنسہٖ۔ تیر کی طرح سیدھی کی سیدھی نصب کر دی گئی۔ جو آج تک اسی مضبوطی اور استحکام کے ساتھ کھڑی ہے۔ پھر اس کے گرد نہایت جسیم لٹھے شہتیر اور اڑواڑے لگا کر بنیادیں کھنچ دیں۔ جو چھ سو برس گزر جانے پر بھی جنبش کھانی نہیں جانتی۔

مینار پر کئی سطریں کسی ایسی زبان میں لکھی ہوئی ہیں۔ جو آج تک کسی سے نہیں پڑھی گئیں۔ بلکہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت بھی سلطان نے اس تحریر کے پڑھے جانے کی کوشش کی تھی بہت سے ودوان پنڈت بھی بلائے تھے انھیں بیش قرار انعام کا بھی اُمیدوار بنایا۔ مگر جب سے آج تک کسی سے ایک حرف

بھی اس کا نہ چلا۔ وہ تحریر کیا ہے مینار کے گرداگرد کچھ حلقے سے بنے ہوئے ہیں۔ جو پانچ چھ سطروں میں ختم ہوتے ہیں۔ اور بس۔ اگر آجکل کا جدّت طراز زمانہ ہوتا تو کیا عجب ہے جو کوئی منچلا یہ الفاظ تصنیف کر دیتا کہ جہاں پناہ اس عبارت کا صاف منشا یہ ہے کہ مُدّت مدید کے بعد ایک مسلمان بادشاہ ایسا اولیا پیدا ہوگا جو اس مینار کو جگادھری سے اکھاڑ کر دِلّی اپنے قلعے میں نصب کرائے گا۔ اس بادشاہ کی سلطنت ایسی عظیم الشان ہوگی۔ اور اس قدر دیرپا ہوگی کہ کبھی اس کو زوال نہ ہوگا یہ ہوگا اور وہ ہوگا۔

ایسا کچھ لکھا کہ لکھتا ہی رہا میں عمر بھر
چُوم لوں گا ہاتھ اپنے کاتبِ تقدیر کے

کھنک یاد دلاتی ہے۔ ہائے شام اور سانولی شام۔ برسات کے آخری مہینے (بھادوں) کی شام۔ شہر بھی دلّی سا شہر۔ اس پر طرّہ لال قلعے کے نیچے ہو کر گزرنے والی جمنا کا کنارا۔

اس دریا کے آہنی پُل کے پیل پایوں میں سے (جن کا کافی حصہ باہر کو نکلا ہوا ہے) ایک پر ہماری نشست۔ وہ آفتاب لب بام کا جوبن وہ ڈوبتے وقت اُس کی کرنوں کا عالم موجودات کو سنہری پوشاک پہنانا گویا کسی ستم کیش کی دھانی پوشاک میں کلابتو کے تار بھرے جارہے تھے دیکھتے ہی دیکھتے یہ منظر آنکھوں سے اوجھل ہوا تھا کہ ایک اور خوشنما سین نرالی ادا سے ظاہر ہوا۔ خورشید نے جاتے جاتے ازراہ شرارت لیلٰی نیلی پیرہن (آسمان) کے منھ پر غازہ مل دیا۔ یعنی آسمان کے مغربی حصے پر دفعتاً شفق پھول گئی جس نے دریا کے آدھے حصے کو آتشی رنگ میں رنگ دیا۔ نہیں بلکہ پانی میں آگ لگا دی، ہائے جب ذرا نظر ہٹی تو لہلہاتے ہوئے سبزۂ جو کی بہار۔ ہلکی ہلکی ہوا کی مدد سے اس کا دریا کی طرف بڑھنا۔ پھر یک بیک پیچھے ہٹنا....

ایک البیلی شام

کتابِ فطرت کے مطالعہ کرنے والوں نے بہت سی دل لُبھانے والی سینریاں دیکھی ہوں گی۔ اکثر دلچسپ منظر اِن کی نگاہوں سے گزرے ہوں گے۔ ہزارہا سمے ایسے ملاحظہ کئے ہوں گے جن کو دیکھ کر بے اختیار نخل بند چمنستان کن کی عجوبہ گل کاریوں کی داد دینی پڑتی ہے اور خود میری نظر سے سینکڑوں نظارے ایسے گزرے ہوں گے لیکن افسوس میں نے انھیں چشم حق بیں سے کبھی نہ دیکھا۔ اِن کی حقیقت کو نہ پہچانا۔ اُن سے دلچسپی حاصل نہ کی۔ لیکن آج پہلی دفعہ ہے کہ ایک پیاری اور سہانی شام کا جوبن لوٹا۔ اور اب اس کی ادائیں کچھ اس طرح دل میں اتر گئیں جیسے کسی کا تیرِ نظر جگر میں دوسار ہو جاتا ہے اور رہ رہ کر اس کی

بعینہ وہ نقشہ دکھا رہا تھا جیسے کوئی سبز رنگ پانی میں اپنے حُسن
کی جھلک دیکھنے کے لئے آگے بڑھتا ہو مگر اپنے ہی حسنِ گلو سوز
اور تیرِ نظر کا شکار ہو کر دل پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹ جاتا ہو
شہر کی طرف دیکھا تو کچھ اور ہی عالم تھا کارخانوں کے انجنوں
کا دھواں کالے ناگ کی طرح بل کھاتا یا نات کے اُوپر ہوتا ہوا دریا
کی طرف بڑھا آرہا تھا گویا ہوائیں کالے لہرا رہے تھے
تھوڑی دیر بعد دوسری سبزی پیش نظر ہوئی یعنی شفق پر
رات کی بڑھتی ہوئی سیاہی دوڑ گئی۔
پانی میں اس کا دھیما دھیما عکس گواہی دے رہا تھا کہ یہ اب چلی
اب ہوا ہوئی۔ آخر یہ دُلہن بھی حُجلہ نشین ہو گئی۔ اب دریا کی آبی
چادر بالکل سیاہ تھی۔ چاروں طرف سناٹا چھانے لگا اور وہی
برساتی گدلا پانی جسے شفق کے پَرتو نے آتشیں بنا رکھا تھا بالکل
نل گیجا ہو گیا اب چونکہ ہوا میں ایک قسم کا سکون تھا اور خاموشی
زیادہ بڑھتی جاتی تھی مچھلیوں کا اُبھرنا دریائی جانوروں کی
رہ رہ کر نمود۔ مرغابیوں کا تیرنا کبھی غوطہ لگانا کبھی اُوپر آجانا

گویا ان الفاظ کا مترجم تھا کہ شام ہو چلی ہے جلدی سے شکار ہاتھ لگ جائے تو دوزخ کی آنچ بجھا کر بسیرے کی فکر کریں۔ دفعتاً اتنے میں ایک اور گُل کھِلا۔ جانب شمال سے گھٹا اُٹھی۔ ہوا تیز و تند چلنے لگی بادل گرجا۔ بجلی چمکی اور دریا کے نظارے کو اُس نے اور بھی چار چاند لگا دیئے۔

برسات کی بہار

جس وقت ہندوستان کا گوشہ گوشہ گرمی کی آنچ سے سُلگتا ہے اُس وقت خاص کوہستان جھالاوارڑ[1] باغ وبہار کا حکم رکھتا ہے جس کو یقین نہ ہو وہ جُون جولائی میں یہاں آکر خود دیکھ لے وہ وہ اُودی اُودی سانولی گھنگور گھٹائیں گھرتی ہیں کہ باید وشاید۔ وہ کبھی رم جھم کبھی تل دھار اور پر دھار مینھ برستا ہے کہ رہے نام سائیں کا۔ برستا ہے تو آٹھ آٹھ دن نہیں کھلتا۔ کبھی کبھی ہلکی پُھوار پڑتی ہے اور جب برس کر گھڑی دو گھڑی کُھلتا ہے تو رنگا رنگ بادل افقِ مشرق پر سجانے کے لئے سینکڑوں گلدستے بھی پیش کر دیتے

ف جھالاواڑ راجپوتانہ میں ایک ریاست ہے جہاں حضرت آغاشاعر مہاراجہ کے مصاحب خاص تھے۔

ہیں جن کو عالم خیال کے مصور اگر وقت ملے تو گھنٹوں دیکھا ہی کریں یوں تو دارجلنگ کوئن آف ہلز مشہور ہے مگر وہاں انتہا کی مرطوبیت ہے۔

شملہ اور کوہستان جھالا وارڑ اس موسم میں کچھ تھوڑا ہی سے فرق رکھتے ہیں۔ مینھ برس کر کھلنا وہاں کا اور یہاں کا یکساں ہے روئی کے گالے ہوا پر وہاں بھی اڑتے ہیں۔ یہاں بھی۔ اُفق آسمان کے محیط گھیرے کے نیچے سرسبز پہاڑیوں کا سلسلہ وہاں بھی ہے یہاں بھی۔

گو کم کم ہی وہاں اکثر اوقات کُہر پڑتی ہے اور گھنٹوں دھوئیں کا سمندر موجیں مارتا ہے یہاں اس کا پتہ بھی نہیں۔ سرسبز نکھرے نہائے درخت وہاں بھی کثرت کے ساتھ ہیں یہاں کم کم مگر یہاں کی روئیدگیاں روشن روشن نظر آتی ہیں یہاں ہرن اور چکارے چوکڑیاں بھرتے ہیں۔ لنگوروں کی ڈاریں کی ڈاریں چھلانگیں مارتی اِدھر سے اُدھر گزر جاتی ہیں۔ جنگلوں میں شیر چیتے، تیندوے دہاڑتے ہیں، ندیاں چڑھتی ہیں، تالاب چھلکتے ہیں اور اس زور

زور شور سے چڑھتے ہیں کہ بعض اوقات ندیوں کے زور سے کئی کئی دن تک مسافروں کی آمدورفت بھی بند ہو جاتی ہے ڈاک تک رسوں کے ذریعہ سے بالا ہی بالا کھینچی جاتی ہے۔ سرسبز وادیوں کا تو کیا کہنا گویا قدرت اس موسم میں غریب بے زبان چوپایوں کے لیے طرح طرح کی جڑی بوٹیوں کا دسترخوان خود بچھا دیتی ہے۔ گائے، بھینس، بھیڑ، بکریاں اور مختلف چوپائے من مانی مرادیں پاکر دن رات مگن ہو ہو کر چرتے ہیں اور کلیلیں کرتے ہیں۔ راتوں کو بھینسوں کی چرائی ایک اَنٹ چیز ہے جو کبھی ناغہ ہی نہیں جاتی اور تمام تمام رات ان کے گلے کی گھنٹیاں اور ان کی ٹن ٹن کی آوازیں برابر سنائی دیتی ہیں جس سے بار بار یہی دھوکا ہوتا ہے کہ جیسے کوئی لدا پھندا قافلہ کہیں کوچ کر رہا ہے۔

البتہ میوے دانے کا کچھ مذکور نہیں بس کمی اگر ہے تو یہی ہے کہ یہاں کسی موسم میں بھی کوئی ایسا میوہ نہیں ہوتا جس سے جی خوش ہو جائے نیت سیر ہو سکے۔ ہاں نظر فریب نظارے

اکثر مہیا ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً راجپوتانے کا سب سے زیادہ حسین اور خوش نما پرند مور ہے جو سینکڑوں کی تعداد میں یہاں ہر وقت پر مارتے ہیں اور اپنے قدرتی نقش و نگار سے انسانی آنکھوں کو محو حیرت کرتے رہتے ہیں راتوں کو ان کی پی ہو پی ہو کی آوازیں بلکہ خاص اس وقت جب کہ بھرن پڑ رہی ہو اور رات سائیں سائیں کر رہی ہو کچھ عجیب دل فریب اور دل کش ہوتی ہیں۔ جن سے مُردہ دل سے مُردہ دل کے پہلو میں گُدگُداہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

وہ اُودی اُودی گھٹائیں ہرے ہرے پربت
ریاضِ خُلدِ بریں ہے یہ جھالاواڑ نہیں۔

تاجدارِ دکن کی سواری

یہ دکن کے شیر دل تاجدار خُلد آشیان نواب سر محبوب علیخاں بہادر کی سواری کا ذکر ہے جو اُس وقت کے حیدر آباد کا محبوب تھا۔ ایسا حسین تاجدار ایسا دلیر فرمانروا جو پیدل شیر کا شکار کرتا اور جب وہ سرو قد کھڑا ہوتا تھا تو اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں سے نیچے لٹکتے تھے چنانچہ ایک دن سرِ راہ کھڑا تھا جو بگل کی آواز آئی اور معاً انسانوں کا سمندر دو طرف پہاڑ بن کر استادہ ہو گیا اور بیچ میں راستہ چھوڑ دیا گیا تاکہ شاہی سواری گزر جائے

الٰہٰ اللہ اب جو میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک برق وش جو کڑی تھی جو آندھی اور مینھ کی طرح چلی آتی تھی اُس پر بھی کوڑے پر کوڑا پڑ رہا تھا۔ فٹن کا رنگ بالکل زرد تھا جس میں چار سُرخ گھوڑے

بجتے ہوئے تھے۔ سرکاری سواری کے دونوں طرف بھی آگے پیچھے پولیس کے کئی سرکردہ فوجی وردی میں گھوڑے مارے چلے آتے تھے۔ اعلیٰ حضرت کی سواری کے پیچھے کئی کئی خانے بھی گاڑیوں میں تھے۔ مثلاً آبدار خانہ۔ جواہر خانہ۔ پوشاک اور ضروریات تک کی گاڑیاں تھیں اور سب کی سب اُڑی چلی جاتی تھیں۔ حضور پُر نور میر محبوب علی خاں بہادر دستار و قبا پہنے۔ گُلکس لگائے صدر میں تشریف فرما تھے اور جمال صاحب اک خاص مقرب خواجی میں بیٹھے تھے

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہمارے موجودہ تاجدار دکن ہز اگزالٹیڈ ہائنس ـ ـ ـ ـ ـ میر عثمان علی خاں بہادر جیسے بیدار مغز شہریار ولی عہد سلطنت تھے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرہ بھر پس و پیش نہیں کہ گو اس وقت حیدرآباد کی یہ موجودہ صورت ہرگز نہیں تھی۔ یہ گھما گھمی یہ آرائش بلدہ کا خاص محکمہ، یہ ترقیاں عثمانیہ یونیورسٹی، یہ پُل، یہ باغات، یہ بڑے بڑے راستے یہ خوب صورت جدید قسم کی عمارتیں پہلے نہیں تھیں تاہم ع بلا گردان

شاہ وقت ہاشم۔ گذشتہ نظام کی وہ آخری سواری بھی
جو آنکھوں نے دیکھی ہے بے شک ایک عجیب چیز تھی۔

اُستادِ داغؔ کی اصلاح

حیدر آباد میں یکایک، اُسی زمانے میں ایک طرح ہوئی۔ ع
تجھلک میرے لئے کسک میرے لئے " میں نے بھی حسب معمول
کچھ شعر اُسی زمین میں لکھ لئے مگر ایک مصرعہ اولیٰ ایسا پیدا ہو گیا کہ
میں مر مر گیا مگر کسی طرح دوسرا مصرعہ بہم نہ پہنچنا تھا نہ پہنچا۔ آخر اسی
طرح بغرض اصلاح استاد کے پاس حاضر ہو گیا۔ مگر آج استاد
بالکل ذروں میں آفتاب کی طرح نمایاں تھے۔ عین صدر میں ایک
خوبصورت پلنگڑی بچھی تھی گرد وپیش سفید چاندنی کا براق فرش تھا
اُس پر تلامذہ آپ کو کالبدر فی النجوم حلقہ کئے تھے میں نے سلام کیا
اور پائینتی کی طرف آپ کے قدموں میں جگہ لے کر بیٹھ گیا اور

بھائیوں کی اصلاحیں ہوتی رہیں۔ استاد کا قاعدہ یہ تھا کہ ایک صاحب اپنی غزل پڑھتے سارا مجمع سنتا، پھر جو مصرعہ متنازعہ فیہہ ہوتا اسی پر سب مل کر مصرعہ لگاتے جس کا مصرعہ استاد پسند فرماتے بس وہی مصرعہ لکھ دیا جاتا۔ مگر میں اس قسم کی اصلاح کا ہرگز روادار نہیں تھا کہ میں مجمع میں بہر اصلاح غزل پڑھوں اور استاد کے سوا کوئی اور صاحب بھی اس میں خواہ مخواہ لقمہ دیں اس لئے میں کبھی ایسے وقت اصلاح کے لئے جاتا ہی نہیں تھا۔ مگر آج مجھ پر بری بنی تھی اس پر بھی میں دیر تک خاموش بیٹھا رہا جب میں چلنے کے مقصد سے اٹھا تو استاد نے خود ہی فرمایا کیوں کیا تم نے اس طرح میں ابھی تک کچھ نہیں لکھا؟

میں، لکھے تو کئی شعر ہیں مگر استاد ایک مصرعہ اولیٰ ایسا ٹیڑھا آپڑا ہے کہ اسے چھوڑنے کو جی بھی نہیں چاہتا اور دوسرا مصرعہ بھی نہیں ہوتا۔ فرمایا۔ اچھا مصرعہ تو پڑھو میں نے اس وقت عرض کیا ع مژدۂ وحشت ہے غنچہ کی چٹک میرے لئے" یہ زمین ہے۔ اس پر میرا ایک مصرعہ اولیٰ یہ ہو گیا ہے۔

ع۔ آنکھ لگتی ہے خیالِ نوکِ مژگاں میں کہاں" اب مصرعہ ثانی مجھ سے تو ایسا نہیں ہوتا۔ استاد دہرا کر "آنکھ لگتی ہے خیال نوک" پھر اب کیا چاہتے ہو؟ کیا کھٹک میرے لئے۔ میں خاموش بیٹھا رہ گیا۔ حضرت لیٹے لیٹے فکر فرمانے لگے جو اتنے میں ایک صاحب بول اٹھے

آنکھ لگتی ہے خیال نوک مژگاں میں کہاں
رات دن قسمت میں لکھی ہے کھٹک میرے لئے

فوراً شور برپا ہوگیا آہاہا۔ خوب مصرعہ لگایا۔ بھئی واہ مصرعہ چھین لیا پھر بھی میں اسی طرح گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ شاید حاضرین کو ناگوار ہوا ہو۔ مگر استاد برابر فکر کرتے رہے اور انھوں نے لیٹے ہی لیٹے تھوڑی دیر میں فرمایا دیکھو بھئی،

آنکھ لگتی ہے خیالِ نوکِ مژگاں میں کہاں
تیر بارانی ہے پلکوں کی جھپک میرے لئے

اس پر تو چھتیں اڑ گئیں۔ واہ واہ سبحان اللہ کے نعرے بلند ہوئے مگر میں پھر اسی طرح پتھر کا بنا بیٹھا تھا۔ استاد نے نہایت غیظ سے

میری طرف دیکھا اور بے چین ہو کر اُٹھ بیٹھے میں نے دوڑ کر گاؤ تکیہ کمر سے لگا دیا اور استاد پھر غور کرنے لگے چند منٹ کے بعد فرمایا

آنکھ لگتی ہے خیال نوک مژگاں میں کہاں
تیر کے پیکاں ہیں پلکوں کی کھٹک میرے لئے

پھر شورش ہوئی بس اب صاف ہو گیا بالکل صاف مگر میں بدبخت پھر اُسی طرح بیٹھا تھا۔ یہ دیکھ کر استاد نے باآواز بلند حاضرین کو سرزنش فرمائی۔ خاموش رہیے صاحب آپ لوگ خاموش رہیے۔ یہ میرا ان کا معاملہ ہے۔ وہ اگلا تو منھ سے پھوٹتا ہی نہیں اتنا کہہ کر پھر انھوں نے پہلو بدلا اور میں نے دوسری طرف تکیہ لگا دیا۔ اب وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ میاں تم بھی تو کچھ زور لگاؤ۔

میں نے قصور واروں کی طرح نہایت عاجزانہ ان کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر کہا استاد۔ آنکھ لگتی ہے خیال...... اس کا دوسرا مصرعہ میں ایسا ہی چاہتا ہوں۔ اب تو حاضرین کی سِٹّی گُم ہو گئی۔ مگر آفرین ہے اُس مرحوم سخن گو کو وہ پھر فکر میں مستغرق

ہو گئے۔ اب کے بڑی دیر تک غور کرتے رہے۔ یکایک میری طرف مسکرا کر دیکھا اور فرمایا

کیوں بھئی ضدی آدمی اب یہ کیسا ہے؟

آنکھ لگتی ہے خیال نوکِ مژگاں میں کہاں

برچھیاں کھائی ہیں جھپکا نی پلک میرے لئے

بس یہ سننا تھا کہ میں پائنتی تو بیٹھا ہی تھا دوڑ کر اُن کے قدم لے لئے۔ اے قربانت شوم یہ ہے اصلاح کہ ایک مصرعہ مبہم سا میں نے بکا اور دوسرا مصرعہ لگا کر نواب فصیح الملک مرحوم نے سارا شعر با معنی کر دیا۔ اللہ اللہ کیا استاد بے بدل تھا یہ چیز ہے اصلاح اور یہ اب اس دنیا سے مفقود ہو چکی۔

اُٹھ گئے ہیں اِس جہاں سے کیسے کیسے باکمال

جن دماغوں کی تراوش اک نیا الہام تھا

ادبی صحبت

خدا کی شان ایک دن میں دیکھتا کیا ہوں کہ آنریبل سر عبدالقادر صاحب معہ شیخ محمد اکرام صاحب ہنستے مسکراتے میرے گھر میں چلے آتے ہیں آہا! دل نہال نہال ہو گیا۔ برسوں کے بچھڑے ملگئے میری تو باچھیں کھل گئیں۔ کیونکہ یہ دونوں میرے دیرینہ دوست تھے یہ سر عبدالقادر صاحب جتنے بڑے تھے اُتنے ہی دوستی تو دوستی ہر اعتبار سے بڑے نکلے

(OBSERVER)

اول اول آپ اخبار آبزرور کے ایڈیٹر رہے۔ پھر مخزن جیسے محبوب رسالے کے موجد بنے اور پھر خدا کے فضل سے لاہور ہائی کورٹ کے جج بھی ہو گئے۔ چنانچہ آپ دونوں کو دکن میں

دیکھتے ہی میں تو سچ مچ خوشی کے مارے اُچھل پڑا

میں۔ ہیں شیخ صاحب! آپ یہاں کہاں؟ اور وہ مخزن کو آپ نے کس پر چھوڑا

شیخ صاحب! مصافحہ کرتے ہوئے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے

ہم یہاں مخزن کے لئے ہی تو آئے ہیں۔ آج کل یہاں دارالترجمہ قائم ہوا ہے جس میں ملک کے بہترین اہل قلم اور صاحب بصیرت لوگ بلائے گئے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی، مولوی عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار وغیرہ بھی یہاں ہیں۔ آؤ۔ چلو تمھیں علامہ شبلی سے ملا لائیں۔ وہ بے چارے تمھیں کئی دفعہ پوچھ چکے ہیں۔

میں۔ کیا خوب؟ مجھے۔ وہ مجھ غریب کو کیا جانیں!

شیخ صاحب! اجی ہم تو جانتے ہیں۔ میں نے اُن سے آپ کی مدح سرائی کی تھی۔ ہاں میں نے ہی اُن سے کہا تھا کہ آج ایسا غزل کا پڑھنے والا۔

میں۔ بس بس جناب رہنے دیجئے۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتوں کے بعد۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ رات کے

نو بجے تک ہمارا یہ سیر گشت برابر جاری و ساری رہا۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم سر مہاراجہ کشن پرشاد کی ڈیوڑھی پر پہنچے۔ یہاں پنڈت رتن ناتھ سرشار اور منشی دوارکا پرشاد صاحب اُفق سے ملاقات ہوئی فی الحقیقت پنڈت جی بلا کے بذلہ سنج اور لطائف و ظرائف کے بادشاہ تھے۔ اُن کو دیکھتے ہی مجھے پنڈت برج نرائن چکبست مرحوم یاد آگئے جو بالکل اُن کی ضد تھے۔ وہاں سے پھر ہم شاہ علی بنڈے پہنچے اور سرکار رائے رایان بہادر امانت ونت آصف جاہی کے دولت کدے پر حاضری دی۔ یہاں وہ لطف صحبت رہا کہ میں جب تک زندہ ہوں کبھی نہیں بھولوں گا۔ یعنی منشی نادر علی برتر، ترکی، مولانا گرامی اور حسامی کے کلام سے ہم سب مستفید ہوئے خصوصاً مولانا عبدالقادر گرامی کی وہ فارسی کی غزل جو انھوں نے تنائدیشِ شیخ علی حزیں کی غزل پر لکھی تھی کچھ اس شان سے سنی کہ ہم سب قریب قریب مدہوش ہوگئے

ہائے گرامی مرحوم گرامی! میں تجھے کہاں سے لاؤں؟

گو میں کیا اور میری رائے کیا؟ لیکن کیا کروں اس دل سے مجبور ہوں گرامی مرگیا! اور مجھے مرنا ہے۔ میں نے رستہ چلتے آغا سنجر کا

کا کلام بھی سنا۔ حضرت آغا شوستری جیسے بزرگ عامل باعمل، قیافہ شناس اور حضور نظام آصفِ سادس میر محبوب علی خاں بہادر کے استاد کی زیارت بھی کی۔ اُن کا کلام بھی انھیں کی زبانی سُنا مگر ہائے ہوشیار پور کی خاک کے درخشندہ جوہر مرحوم گرامی! تو حقیقت میں گرامی تھا۔ افسوس اس حافظے کو کیا کروں؟ بجز ایک مصرعہ کے خاک یاد نہیں آتا۔

سامعین تو بے تاب تھے ہی۔ میں کمبخت مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔ وہ مصرعہ یہ تھا ع

رگ لیلیٰ زدند آنگاہ ز مجنوں خوں چکید ایں جا

اس لطف انگیز صحبت کے بعد ہم علامہ شبلی اور مولانا شرر لکھنوی کے مستقر پر جا دھمکے شیخ صاحب نے دونوں سے میرا تعارف کرایا اور میں نے بھی ایسی سربرآوردہ ہستیوں کو عمر میں سب سے پہلی دفعہ دیکھا۔ یہ دونوں جلیل القدر نہایت بااخلاق اور محبت کرنے والے بزرگ تھے۔ اللہ اللہ! وہ اُن کے حکیمانہ نکات، وہ باتوں میں چھوٹوں کی عزت بڑھانی، وہ اُن کی

شفقتیں، آہ! کس کس چیز کا ذکر کروں؟

میرا گُناہ

اہل مغرب کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ گناہ برائیوں کا بادل ہے اس مختصر فقرے پر اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو ٹھنڈے سانس کے ساتھ ہی ندامت کا پسینہ بھی ہر گنہگار کے ماتھے پر ہو گا آہ سُن سُن! او پاپی جیوڑے سُن! میں تجھ سے پوچھتا ہوں سچ کہنا کیا تو ماں کے پیٹ سے ہی گنہگار پیدا ہوا تھا۔ نہیں کبھی نہیں جب میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اے دل! اے میرے رفیق گناہ! تو ایک نورانی آئینہ تھا۔ ایک لہلہاتا ہوا کنول۔ تجھ میں کسی قسم کی سیاہی اور تاریکی کا پرچھاواں بھی نہیں پڑتا تھا۔ تو ایک پنکھڑی سے زیادہ نرم اور ہلکا شیشے سے زیادہ صاف شفاف اور حباب سے بڑھ کر نازک تھا اور تجھ میں سے

بہشت کے پھولوں کی خوشبو آتی تھی۔ ٹھہر ٹھہر او کافر دل! میں اس یاد کو پھر تازہ کرنا چاہتا ہوں۔ آہ! یاد ش بخیر۔ جب میں چھوٹے سے پنگھوڑے میں لیٹا ہوا اپنا ننھا سا انگوٹھا چُسر چُسر چوسا کرتا تھا اس وقت وہ گھر کی صاف سُتھری انگنائی، وہ گلابی گرمیوں کی سہانی راتیں۔ اوپر سے کسی ٹھنڈی ٹھنڈی گول ٹکیا کی روشنی و چاندنی، کا آنا۔ اس کے سنہری تاروں کا جگمگ جگمگ کرنا اور آپ ہی آپ میری ایک ننھی جگہ ٹِک جانے والی نگاہوں میں گھُل مل جانا۔ آہ! وہ میں کبھی نہیں بھولوں گا وہ مجھے بہت ہی پیارا نظارہ معلوم ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے مجھے یاد ہے اس وقت میرے سر پہ لمبی لہکاری ایک نیلی سی چھت (آسمان) بھی تھی۔

ہاں ہاں جب میں اندھیرا ہوتے ہی ان گنت سفید سفید چمکیلی چنگاریاں (تارے) بھی جگمگاتی دکھائی دیتیں تھیں۔ وہی گول سی ٹکیا، وہی ٹھنڈی روشنی (چاند)، یا اسی گل تکیئے میں سے آتی تھی۔ آہ! میں اُس سے پہروں پڑا پڑا کھیلا کرتا تھا مجھے یاد ہے

مجھے یاد ہے میں بہتیرا ہمک ہمک کر اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس کی طرف بڑھاتا اس لالچ میں کہ کسی طرح اس پیارے پیارے گل تکیے کو کھینچ کر اپنے ننھے ننھے تکیوں میں ملا لوں جو میرے سرہانے رکھے رہا کرتے تھے مگر افسوس وہ بہت دور تھا وہ بہت اونچا تھا اور میری ہزار ہزار کوششوں پر بھی وہ کسی طرح میرے ہاتھ نہیں آ سکتا تھا

ہاں کبھی کبھی ایک اور نرم نرم چیز (ہوا) سرسراتی ہوئی ایکا ایکی آتی اور میرے پنڈے سے چھو جاتی وہ میرے جھنڈولے بالوں کو بھی پریشان کر دیتی جس سے میرا ننھا سا کرتا یا شلوکا اُڑنے لگتا اور آخر اسی چیز کے بے معلوم کیف سے میری آنکھیں بے اختیار جھپکنے لگتیں اور میں میٹھی نیند سو جاتا تھا مجھے یاد ہے ایک بڑے طویل سناٹے کے بعد یکایک دنیا پھر جاگ اٹھتی اور میرے کانوں میں مختلف آوازیں آتیں اور میں بھی جاگ اٹھتا رات کے بعد صبح ہو جاتی روتا یا بسورتا، چیختا یا چلاتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کبھی کئی ہاتھ مجھے ادھر سے اُدھر الٹتے بدلتے

گو میں اس وقت بالکل مجبور محتاج اور دوسروں کے رحم پر تھا میری دلی خواہش صرف میرے رونے دھونے یا چیخنے چلّانے سے ہی معلوم کر لی جاتی تھی لیکن میں تو ہزار بار یہی کہوں گا کہ میری وہ محتاجی اس خودمختاری سے بدرجہا بہتر تھی میری پاک و پاکیزہ دنیا وہی تھی میرے امن وچین اور بادشاہت کا زمانہ بس وہی تھا وہی

آہ! مگر اس وقت او آستین کے سانپ دل! تو مجھے کیسا بھلا معلوم ہوتا تھا رفتہ رفتہ اور امّی جمّی کے دن آئے۔ میرا دودھ بڑھا۔ مہینوں خوشیاں منائی گئیں۔ رت جگے ہوئے اور اب میں گھٹنوں چلتے چلتے دوڑنے بھی لگا۔ شدہ شدہ ہنسنا بولنا کھیلنا کودنا، ضدیں کرنا، رونا دھونا اور چیخنا۔ قسم قسم کا مجھے اچھی طرح آگیا۔ مگر ان چیزوں نے سب سے زیادہ اب ضدوں کی صورت اختیار کر لی۔ آہ! آہ! وہی ضدیں بڑھتے بڑھتے معصوم عادتیں کہلائیں۔ اور انھیں نامراد عادتوں نے ایک دن مجھے سب سے پہلے گناہ کا مرتکب بھی بنا دیا

آہ! یہ گناہ میرا پہلا گناہ تھا جو میری پیاری ماں کی اول نافرمانی کہنی چاہیئے۔ جس کا وقوع یوں ہوا کہ میں لاڈلا سارے گھر کا لاڈلا ایک دفعہ کچھ بیمار پڑا۔ میری حقیقی محسن محبت کی دیوی مادر گرامی نے مجھے کوئی دوا پلائی۔ دوا کڑوی تھی میں نے دو ہی گھونٹ پیئے تھے جو جی بُرا کیا یعنی زمین دیکھی ہر چند ماں نے پھر بھی قدری کی کہ میں باقی دوا کسی نہ کسی طرح اُگل نگل کر پھر پی جاؤں مگر مجھ نافرمان نے ایک نہ مانی اور حسب عادت چیخنے چلانے لگا اور روتے روتے ضد کرتے کرتے ان کی گود سے تڑپ کر زمین پر پچھاڑیں کھانے لگا۔ غریب ماں میرے اس فریب سے گھبرا گئیں اُنھوں نے فوراً بقیہ دوا کو تو پھینک دیا اور دیر تک اپنے کندھے سے لگائے لگائے مجھ جھوٹے فریبی اور ناشکرے کو بڑے پیار محبت سے تھپکتی رہیں یہاں تک کہ میں سو گیا۔ بس یہی میرا پہلا گناہ تھا۔ اب میں سمجھ گیا کہ کس طرح دو چار جھوٹے آنسو بہا کر دوسروں سے اپنی ناواجب ضد پوری کرا سکتا ہوں۔ بس اب کیا تھا اب تو مجھے یہ لت لگ ہی گئی

اب تو ضدوں کا پُل ٹوٹ گیا۔ اب میں جب بے ضرب جس چیز یا
جس بات کو اپنے خلاف مزاج پاتا فوراً ہی بکھر جاتا اور جب تک
میرے حسب منشا تعمیل نہ ہوتی ۔عمل درآمد نہ ہوتا میں بدبخت یکساں
مچلتا رہتا تو بہ توبہ عمر کے ساتھ یہ ضدیں اور مضموم عادتیں پڑھیں
عادتوں نے رفتہ رفتہ عیوب کا درجہ حاصل کرلیا۔ میری ان ضدوں
سے میری بہشت نصیب ماں کو از حد تکلیف ہوتی تھی مگر وہ ماتنا کی
ماری پھر بھی ہر طرح دلجوئی کرتیں ۔میرا دل میلا نہ ہونے دیتی تھیں
آخر شدہ شدہ ان ضدوں کے سہنے کی انھیں بھی مساوات ہوگئی
اور بغیر روک ٹوک انھوں نے مجھے میری سرکشی کے حوالے کر دیا
جس سے میری آئندہ زندگی کی بنیاد ہٹ دھرمی اور سرکشی پر
بلند ہوتی چلی گئی ۔ ظاہر ہے کہ ؎ خوئے بدرا بہانہ بسیار، شدہ شدہ
ایک سے دو، دو سے چار گناہ کا اضافہ ہوگیا اور اب مجھے ایسا
معلوم ہونے لگا کہ وہی نور سے معمور دل جو فطرت نے اپنی فیاضی
سے نہایت پاک و شفاف عطا کیا تھا اب اس پر خود بخود دھلوئیں
چھائیاں اور بدنما داغوں کی سی جھلکیاں نمودار ہونے لگیں۔

گو مجھے اب بھی چنداں احساس نہیں ہوا تھا تاہم یہ ضرور تھا کہ ایک جرم کے بعد دوسرا تیسرا جرم کرتے ہی اب مجھے گناہ کی بھوک سی معلوم ہونے لگی۔ جس نے رفتہ رفتہ میرے گناہوں کی فہرست کو نہایت طولانی کر دیا چنانچہ زمانے کے انقلاب کے ساتھ ساتھ یہ بیل اور بڑھی اور اب ادب و آداب نشست و برخاست تعلیم و تربیت نوشت و خواند میں ایک اکھڑ رعونت پیدا ہو گئی۔ دور پر دور گزرنے لگے مگر اُن کے ساتھ ہی میری بے باکی رعونت خشونت اور سرکشی خود غرضی، اور نا عاقبت اندیشی بھی میرے ساتھ ہی جوان ہوتی گئی۔ اب میں بے تکلف جھوٹ بولتا جب ضرورت فریب کرتا۔ بے جھجک اپنا مطلب نکالتا بلکہ آئے دن چھوٹے چھوٹے گناہ تصنیف کر لینے کی بھی مجھ میں خاص قابلیت پیدا ہو گئی اب میں پہروں گھر سے غیر حاضر رہتا یار غاروں اور بری صحبتوں کے لوگوں میں غارت غول۔ اچھوں سے نفرت۔ بروں سے پیار جھگڑے فساد۔ شہرہ پشتی، غرض سب گنوں پورا ہو کر رہ گیا اب جا کر بزرگوں کی بھی آنکھیں کھلیں چاؤ پیار میں بھی

اب تیوریاں بدلیں سخت سے سخت سزائیں بھی مجھے دی گئیں مگر
اب وقت گزر چکا تھا۔

افسوس صد افسوس گناہ کی لت اب میرے خمیر میں سرایت
کر چکی تھی اور اب اسے دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے نہیں چھڑا سکتی
تھی۔ شعلہ پر شعلہ پہلے تو لاڈ پیار میں صد ہا روپے کے اخراجات
میرے لئے برداشت کئے جاتے تھے خوب خوب اللّے تللّے
ہوتے تھے مگر اب روپے پیسے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا گیا۔ بس
خوئے بد کے لئے یہ اور تازہ ستم ہوا۔ وہاں ہاتھ کھینچا گیا۔ یہاں
قدم گھر سے باہر نکلا۔ ادھر جوانی دیوانی زوروں پر۔ جذبات کا
طوفان نئے نئے ذوق وشوق سر پر سوار۔ چٹ گھر سے باہر
نکل کھڑا ہوا۔ اب چوری بدمعاشی سرزوری غرض چند ہی روز میں
پنج عیب شرعی سے آراستہ ہو کر میں ہر فن مولا ہو گیا۔ بس اب
کیا تھا؟ جس کی اُتر ی لوئی اس کا کیا کرے گا کوئی اب بھلا گناہوں کی
کیا کمی تھی طرہ یہ ہوا کہ گناہ کرتے کرتے اب گناہوں کی ہیکڑی بھی مجھ پر
چھا گئی۔ محنت مشقت سے عار کاہلی آرام طلبی حظّ نفس مطلب پرستی

میرا شیوہ ان سب نے مل کر مجھے انسان سے بہائم میں لا کھڑا کیا اور میں آنکھوں دیکھتے بالکل اندھا ہو گیا اندھا۔

اتفاق کی بات جوان جان موٹا مسٹنڈا الحیم شحیم تو تھا ہی۔ کمزوروں پر دباغت بٹھا کر فوراً ہی ایک جرائم پیشہ جتھے کا سرغنہ بن گیا مال مفت دل بے رحم اب تو دن عید رات شب برات تھی۔ چند روز بعد یوپی کے ایک بھرے پرُے غنچہ سے شہر پر میں تے جا قبضہ کیا اور بھی خاصی ڈاکہ زنی ہونے لگی۔ واردات پر واردات۔ نمبر شمار بڑھتا ہی گیا مردہ جائے بہشت میں یا دوزخ میں ہمیں اپنے حلوے انڈے سے کام لئے کوئی۔ مواخذہ کسی سے ہو۔ ہمارا حصہ سوایا گھر بیٹھے پہنچنے لگا شہر بھر میں غُل مچ گیا۔ سیر سپاٹے کو نکلے تو ہر وقت دس بیس لٹھ بند مجرد و بے قید۔ سرکار سرکار کی آوازیں آنے لگیں۔ یکایک، میرا دماغ آسمان پر جا پہنچا خدا کی خدائی محکوم نظر آئی۔ کیا مجال کسی کی جو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ رستہ چلتے جس مہاجن نے دکان پر سے اٹھ کر ہمیں سلام نہ کیا بس گویا موت کو نیوتا دے دیا جس نے ہمارے حکم کے موافق ہنڈی نہ سکاری گھر بار کا صفایا مال و متاع

ضبط۔ کیا تاب وطاقت جو شہر میں کوئی ڈوم ڈھاڑی لیس کی ٹوپی پہن کر نکل جائے تو بہ توبہ اگر کسی نے کچھ چون وچرا کی تو اسی وقت ٹوپی ندارد۔ اور وہ غریب نالی میں

آج زمانے کے نوجوانوں سے ہمارا مقابلہ ہے۔ کل پلٹن والوں سے دو دو ہاتھ ہو رہے ہیں۔ بات کیا تھی۔ وہ بھی شب وروز راتوں کو چھاپے مارتے تھے اور ہم بھی پیشہ ور سے پیشہ ور کی لاگ ڈانٹ۔ رفتہ رفتہ دھوم مچ گئی۔ پولیس تھرا اٹھی۔ حکام بدمزہ ہو گئے بلکہ کانپ اُٹھے۔ آخر کلکٹر ضلع کو سخت سے سخت احکام جاری کرنے پڑے مگر یہاں کس کو پروا۔ یہاں گناہوں کا نمبر بڑھتا ہی جاتا ہے۔ کچہری کیا چیز ہے؟ اور عدالت ہمارا کیا بنا سکتی ہے۔ قاعدے کی بات ہے۔ ایک تو کڑوا کریلہ اس پر نیم چڑھا۔ وہ اور بھی کڑوا ہو گیا۔ اب جس وقت جی چاہتا اور جو چاہتا کر بیٹھتا کھلے خزانے خلق خدا کو آزار دیتا۔ لوگوں کے ننگ وناموس برباد کرتا۔ پھر لطف یہ کہ قصور میرا۔ گناہ میرا۔ مگر فریادی فریاد کرتا تو لوگ مارے خوف کے اسی کو برا کہتے۔ آخر یہ بے رحمی اور سنگدلی یا ثقہ بدمعاشی

یہاں تک بڑھی کہ مجھے دوسروں کے مقابلے اپنی کوئی چیز بھی اچھی نہ معلوم ہوتی۔ اس لئے چوری۔ ڈاکہ۔ خون۔ زنا۔ سب میرے بائیں ہاتھ کے کھیل ہو گئے۔ بیسیوں گلے میں نے اپنے ذرا سے فائدے کے لئے کاٹ ڈالے۔ عورتوں کو بیوہ۔ بچوں کو یتیم کرنا میرا مشغلۂ بے شغلی ٹھہرا۔ مگر تعجب یہ تھا کہ ان سنگین گناہوں پر بھی اب تک مجھے کوئی سزا نہیں ملی تھی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہی میرے محسن مجھے نیستی سے ہستی میں لانے والے اُن عزیزوں کی نگاہوں میں میری طرف سے زہر بھر گیا تھا وہ جب کبھی مجھے پاتے تو چھری کو نہ پاتے اُن میں ایک بھی میری صورت دیکھنے کا روادار نہیں تھا بلکہ دل ہی دل میں جتنی بد دعائیں خلق خدا میرے لئے مانگتی تھی ان سے کہیں زیادہ خود میرے عزیزوں کی بے معلوم بے آواز فریادیں تھیں۔

آہ! آہ! میں دنیا کو مرتے دیکھتا تھا۔ آئے دن میرے سامنے بندگانِ خدا کے جنازے پر جنازے نکلتے۔ مگر اپنی موت کا مجھے کبھی جھوٹوں بھی خیال نہیں آیا گویا موت صرف اوروں ہی کے لئے بنائی گئی تھی مجھے اس سے کوئی سروکار ہی نہ تھا ——— میں

خدا کی خدائی کو اپنا محکوم بادشاہ وقت کو اپنا ہم عصر اور شہر کی رعایا کو اپنا باجگذار سمجھتا تھا۔ مگر ہاں ہاں یہ میرا ہزاروں دفعہ کا تجربہ ہے کہ بدایں شقاوت قلب جب کبھی بھی گناہ کا ارادہ کرتا تو اسی ناپاک اور فولاد دل میں سے جو اب توے کی طرح سیاہ ہو گیا تھا اُس میں سے ایک آواز برابر یہ کہتی سنائی دیتی تھی کہ او بدبخت پاپی۔ راندۂ درگاہ۔ دیکھ یہ گناہ ہے۔ بدترین گناہ اور اس کی سزا تجھے ضرور بھگتنی پڑے گی۔ او ظالم خونی قاتل دیکھ اب بھی سنبھل سنبھل نہیں تو کوئی دن جاتا ہے۔ جو تیری یہ سرکش گردن انصاف کی تلوار سے کاٹ ڈالی جائے گی۔ تو ایک ذلیل مچھر کی طرح مسل ڈالا جائے گا ہوشیار۔ ہوشیار ——— اس غیبی آواز کو سن کر میں بھونچکا تو ہو جاتا تھا۔ اِدھر اُدھر اُوپر نیچے دیکھنے بھی لگتا تھا۔ مگر افسوس اس وقت وہ گناہوں کی ہیکڑی مجھ پر پھر چھا جاتی اور میں پھر سب کچھ بھول بھال کر اقدام جُرم کے لیئے فوراً تیار ہو جاتا۔ حالانکہ اختتام جرم تک وہی پُرشوکت آواز مجھے برابر ملامت کیئے جاتی تھی۔ آخر پیالہ لبریز ہو گیا آغاز کا انجام یکایک رو براہ ہونا تھا ہوا اور وہی ہونی شدنی

وہی نہ ٹلنے والی گھڑی میرے سر پر بھی آ گئی وہ جس کے آتے ہی جانداروں کی ایک بڑی تعداد ہر ثانیئے پر اپنے ہزار ہا قالب چھوڑنے پر مجبور رہے۔ آہ آہ وہ موت آ گئی اُس نے اچانک میرا گریبان بھی پکڑ لیا۔ وہ موت ! وہ جس نے زار روس کو بال پکڑ کر بستر خواب سے کھینچ لیا تھا جس نے ملکہ وکٹوریہ جیسی رحم دل ملکہ کو باوصفیکہ جواہرات میں تول دینے کی قابلیت تھی۔ حاذق طبیبوں کی موجودگی میں ایک منٹ ایک ثانیئے کی فرصت نہ دی۔ وہی موت آخر میرے سر پر بھی آ موجود ہوئی بند ہونے سے پہلے اب میری آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے کھلیں اور مجھے اب معلوم ہوا کہ دراصل میں کون تھا اور یہاں کس لئے آیا تھا اور میں نے آ کر یہاں کیا کیا ؟ مگر افسوس صد افسوس اب بصارت اور بصیرت دونوں مجھ سے چھین لئے گئے تھے عقل و ہوش گم۔ دل و دماغ معطل تھے آنکھیں بے نور تھیں کان بہرے۔ دست و پا بیکار محض ——— دفعتہً سانس کھینچنے لگا۔ سکرات و اختصار کے ساتھ ہی کسی نے وہ نورانی شعاع کھینچ لی جو کسی نورٌ علی نور کی بخشش تھی اور جس سے میں زندہ

تھا۔ اللہ اکبر! لوگ اسی کرب و اذیت کو کسی ریشمیں لباس کو کانٹوں پر ڈال کر کھینچنے سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ توبہ توبہ میرے خیال میں ایک غیر ذی روح کو کسی تشدد یا الجھن سے کیا علاقہ۔ آہ موت کی اذیت کچھ وہی جانتے ہیں جن کو موت کے دروازے سے گزرنا پڑا ہے میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں بالکل بے حس و حرکت موت کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا دم آنکھوں میں اور آنکھیں آسمانی جاہ و جلال پر لگی ہوئی تھیں۔ مصیبت یہ تھی کہ ادھر تو روح کا پرند اس مٹی کے پنجرے سے کشمکش کر رہا تھا ادھر مجھ بدبخت کے عمر بھر کے کیئے کوتک سامنے تھے آہ آہ وہ تمام مال و دولت لوگوں کے کلیجوں میں ہاتھ ڈال کر جمع کیا تھا وہ سامان عیش و عشرت جس سے اس وقت بھی میرے حبلو خانے جگمگا رہے تھے سب کے سب نہایت حسرت کے ساتھ دوسروں کے لئے چھوڑنے پڑے۔ وہ مردہ جسم وہ ہیبت ناک صورتیں جن کے گلے میں پھانسیاں ڈال ڈال کر میں نے اپنا مطلب سیدھا کیا تھا آج وہ سب کے سب زندہ ہو کر اسی غیظ و غضب کے ساتھ میری چھاتی

پر چڑھے آتے ہیں اور میں ایک انگلی بھی ان کی طرف نہیں اٹھا سکتا تھا انتقام انتقام کی آوازیں بلند تھیں —— بیسیوں ہاتھ میری طرف بڑھ رہے تھے۔ صدہا کرخت آوازیں تھیں جو میرا نام لے لے کر اپنا مطالبہ کر رہی تھیں۔ اور میں ایک ایسے مجرم کی طرح جس کا کوئی مددگار نہ ہو موت کے دامن کا متلاشی تھا۔

آغا شاعر کا پیغام

آغا شاعر کا پیغام

برادرانِ وطن! میرا خطاب ہر ملکی بھائی سے ہے۔ عام اس سے کہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا گبر، سکھ ہو یا سناتنی، موسائی ہو یا جینی، غرض جو بندۂ خدا اس ملک میں سانس لے رہا ہے یہ میرا پیغام اُسی کے لئے ہے بشرطیکہ وہ بلا کسی مذہبی ہیجان یا رُو رعایت کے میرے اِن سیدھے سادے بولوں کو سُنے۔ اُن پر غور کرے۔ اور خدا اُسے توفیق دے کہ وہ اِس پر عمل پیرا بھی ہو۔

میرے بھائیو! اس میں ذرا شبہ نہیں کہ میں کیا اور میرا پیغام کیا؟ نہ میں کوئی ملکی لیڈر ہوں، نہ عالم ہوں نہ فاضل۔ نہ دولتمند نہ لکھ پتی لے دے کے ایک غریب بے سواد بیمار و

ناتواں انسان اور وہ بھی وہ جو عنقریب اس دنیا سے چلا جانے والا ہے ؎

عدم کو جاتے ہیں تیار ہیں بنے سنورے
تمہاری دیر ہے اب کوئی دیر دار نہیں
(آغا شاعر)

تاہم یہ الفاظ ایک ایسے شاعر کے مخلصانہ جذبات ہیں جس کو کائنات عالم کا ذرہ ذرہ زبان حال سے گویا نظر آتا ہے اس اکسٹھ باسٹھ برس کی عمر میں میں نے یہاں بہت سی تبدیلیاں دیکھ لیں کئی کئی بادشاہتیں بھی بدل چکیں۔ یہاں تک کہ زمانے کے گوناگوں اثرات نے مجھے قریب المرگ بھی کر دیا تاہم میں اس قوی و قادر خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جو دن کو رات سے بدل دیتا ہے اور رات سے پھر دن نکال لاتا ہے۔ کہ ایسا عظیم الشان انقلاب، ایسا عالم گیر مصیبتوں سے لبریز انقلاب میں نے آج تک کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بڑی بڑی باتوں کو تو بڑے بڑے دماغوں پر چھوڑئیے میں تو موٹی سی بات عرض کرتا ہوں۔ دیکھئے آپس کے میل جول کو ہی

دیکھئے۔ یہ ہمارا تمہارا کیا حال ہے؟ کچھ دن پہلے ہمارے بزرگ
ہمارے محلے والے، ہمارے ہمسایہ جب کسی سے رستے یا گلی میں ملتے
تھے تو وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر نہال نہال ہو جاتے تھے۔
اُن میں محبت واخلاص، پاسِ وضع اور بڑے چھوٹے کا لحاظ اس
درجہ تھا کہ کیسے سے کیسا ہی بے پروا آدمی کیوں نہ ہو جب وہ کسی سے
ملتا تو وہ یہ ضرور پوچھ لیتا تھا "آپ کیسے ہیں؟ آپ کے بال بچے
اور فلاں فلاں بزرگ کس طرح ہیں؟ اور کیا میں کسی کام میں آپ کی
مدد کر سکتا ہوں؟"

مگر آج کل وہ میل ملاپ، وہ خلوص، یگانگت خواب وخیال
ہوگئے۔ مجھے معاف کیا جائے اگر میں کہوں کہ اس انقلاب کی بڑی
وجہ ہمارے مقدس لیڈروں اور رہنما پاک وپاکیزہ ریفارمروں کا
وجود ہے جنھوں نے بظاہر قوم اور قومیت کا راگ الاپا۔ لیکن
اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک فریق کو دوسرے فریق سے
سخت سے سخت نفرت کرنا بھی سکھا دیا۔ یہ عام نفرت کی خلیج ملکی
مخلصین کی نیک کوششوں اور روک تھام کے باوجود دن بدن

وسیع ہوتی چلی جا رہی ہے جہاں چاہے دیکھ لو بغیر مطلب کے کوئی کسی سے بات نہیں کرتا جسے دیکھو بغل میں چھریاں اور دوستی کے ارادے ؛

میرے بھائیو! اس غلام ملک کا زیادہ تر حصہ جسے ہمارے مالک بھیڑوں کی طرح دھکیل رہے ہیں۔ ایک مدت مدید سے صرف ملازمت یعنی نوکری کا والہ و شیدا تھا ہمارے تعلیم یافتہ لوگ صرف اسی لئے تعلیم حاصل کرتے تھے کہ اس کے ذریعے انھیں نوکری مل جاتی تھی۔ مگر اب وہ نوکری، وہ غلامی بھی عنقا کا حکم رکھتی ہے۔ آہ آہ! یہ وہ وقت ہے جب کہ خدمت گاری اور چپراسی بھی بڑے بڑے گریجویٹ۔ بعض مجبوریوں سے تمنا کرتے ہیں اور نہیں ملتی۔ بلی کے بھاگوں اگر کہیں چھینکا ٹوٹا بھی اور خوش قسمتی سے کسی کو کہیں کوئی جگہ مل بھی گئی تو مذہبی منافرت اس غریب کا خون پی لیتی ہے۔ عام طور پر اب دنیا ہم پر تنگ ہے۔ ضروریات زندگی نایاب۔ سب سے زیادہ کار آمد چیز روپیہ ہے اور یہ چیز بالکل نابود اور قطعی ناممکن الحصول ہے۔ صنعت اور حرفت کا اول تو دماغ

نہیں اور اگر ہو بھی تو آسانیاں کہاں؟ تجارت کے لئے بیش قرار دولت، اور مقابلے کا دم درود کس میں؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف ملک میں ایک عام بے چینی ہے اور روٹی کے سوا کوئی کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ آہ! آہ!۔ عادتیں خراب، علّتیں لگی ہوئی۔ نہ پا پیادہ دو قدم چل سکتے ہیں، نہ روشنی، پانی، ہوا کے بغیر ہم سانس لے سکتے ہیں اور یہ سب نعمتیں جو خدا کی بخشی ہوئی عام نعمتیں تھیں، ہم بدبخت اُن سے بھی محروم ہیں ؎

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کُشی
مگر کہ زندہ کُنی خلق را و باز کُشی

اس کے علاوہ اب ذرا شہر کی سڑکوں کا جائزہ لو تو ہمیں صدہا بندگان خدا عورت، مرد، بوڑھے، بچے جا بجا خاک میں رُلتے نظر آئیں گے۔ یہ کون ہیں؟۔ آہ! کیا یہ بھی ہماری ہی طرح انسان ہیں؟ جو دن رات گڑ گڑا کر بھیک مانگتے ہیں مگر انھیں بھیک بھی نہیں ملتی۔ نہ پیٹ کو روٹی، نہ تن کو کپڑا۔ وہ بدنصیب بلبلا بلبلا کر فریاد کرتے ہیں مگر کوئی ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا

ملک میں ایک خاص اضطراب ہے جا بجا لوٹ مار، دنگہ فساد قتل و خون، ڈاکے زنیاں شدید سے شدید جرائم کی صورت میں رونما ہیں۔ زلزلے، قحط، بارش، بیماریاں ہزارہا عذاب انسان پر نازل ہیں۔ غریب کمزور بے موت مر رہے ہیں اور زبردست بدمعاش آزادی کے ساتھ چین کر رہے ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات کھلے خزانے عام راستوں پر مردہ نظر آتے ہیں اور بجز بے کسی کوئی اُن پر دو آنسو بہانے والا بھی نہیں دکھائی دیتا۔ ہاں البتہ کتّے اپنی وفاداری کی داستان سے شرابور مخملی گدے تکیوں پر کوچ اور صوفوں پر آرام کرتے ہیں۔ جب کہ محبت سے لبریز خوبصورت چہرے اُن کا منھ چومنا اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ یہ فیشن وہ محبوب ترین لفظ ہے جس نے جگ جیت لیا ہے جس کے پُجاری عورت، مرد، بچے بوڑھے۔ نوجوان سب کے روزانہ ناٹک اور سینما میں ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں وہاں چھنا چھن روپیہ برستا ہے اور ان زندہ دلوں میں سے ایک فردِ واحد بھی اُن فاقہ زدہ مصیبت کے ماروں کا دھیان نہیں کرتا جن پر آسمان اور زمین اس وقت تنگ

ہیں۔ اس فیشن پرست طبقے کی نظر میں شرافت نابود۔ اخلاق برباد عیش پرستی اور اسراف کا جن ان کے سر پر سوار ہے۔ مغربیت ان کو چڑ گئی ہے بے شرمی اور بے حیائی ان کا شیوہ ہو گیا ہے۔ حیا سوز، چُرم ننگی اور برہنہ تصویریں شارع عام پر نصب ہیں ہماری بہنیں بیٹیاں انھیں کن انکھیوں سے دیکھتی چلی جاتی ہیں۔ میرے پیارے ملکی بھائیو! ہمارے اس فیشن کے سیلاب نے ہماری سماج ہماری سوسائٹی کی زندگی کا معیار تو بلند کر دیا ہے مگر اس کی بدولت ہمارے ملک کا سکون اور اطمینان غائب ہو گیا اگر تم میں کچھ بھی غیرت اور انسانیت باقی ہے تو ایشور کے واسطے خواب غفلت سے چونکو۔ اس سیلاب میں کیوں بہے جا رہے ہو۔ خدا کے لئے اپنے جمود اور بے حسی کی دیوار کو ڈھا دو، اپنے بزرگوں کی کفائت شعارانہ زندگی کا نقشہ سامنے رکھو۔ قناعت اور ایمانداری کا آسرا لو محنت اور مشقت سے جی نہ چُراؤ دیکھو تو تم ایک بے جان لاش کی طرح ٹھکرائے جا رہے ہو۔ موت کا زبردست ہاتھ تمہاری گردن پر ہے اب بھی ذاتیات اور تعصّب کو یکقلم تج دو

ایک دل ایک زبان ہو کر متحدہ قوم بن جاؤ ورنہ خوب یاد رکھو تم نہ ہوگے زمانہ ہوگا۔

نہ سنبھلو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں